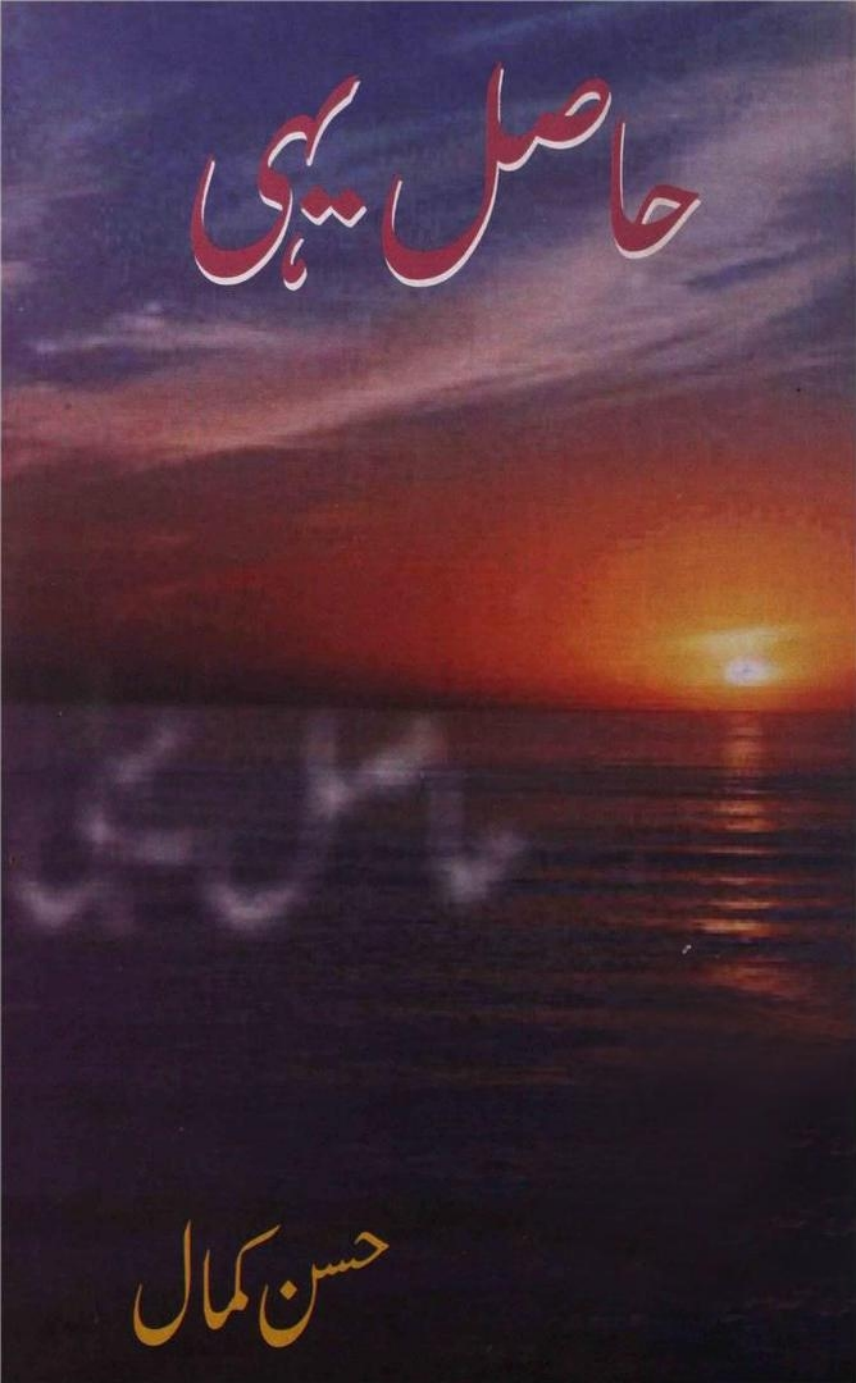

حاصل یہی
حسن کمال

حاصل یہی

(شعری مجموعہ)

حسن کمال

قلم پبلی کیشنز، ممبئی

یہ عرفان کب ملتا ہے؟

کیسے ملتا ہے یہ عرفان؟

عرفان کی طلب میں مہاتما بدھ نے تو لکھنے سے زیادہ سوچنے کو اہمیت دی تھی۔

سوچ کیا ہے؟

بدھ کا جواب ہے.... انتظار کی زبردست اَن تھک ریاضت۔

انتظار کی انتھک ریاضت ہی بولے جانے والے معمولی اور خام لفظوں کو تخلیقی زبان کی رفعت عطا کرتی ہے۔ اسی رفعت کے اردگرد عرفان کا ہیولہ قائم ہوتا ہے۔

مگر یہ عہد مہاتما بدھ کا عہد نہیں، یہاں اب لفظ بس کموڈیٹی ہے اور کچھ نہیں، ان لفظوں کی منڈیوں میں ہم لفظوں سے جنت نگاہ اور فردوس گوش بنا رہے ہیں، سوچ کر کون لکھتا ہے اور کون لکھواتا ہے۔ آج بولا ہوا لفظ سوچے ہوئے لفظ سے افضل ہے۔ اسی لیے مشاعروں میں مشاعرے کا ناظم اہم ہے۔ شاعر بے چارہ بے معنی، لکھا ہوا لفظ کہاں کھو گیا ہے؟ حسنؔ بھی اسے ڈھونڈھ رہا ہے۔

ہوس کی یہ تشنگی نہیں ہے نظر کی آوارگی نہیں ہے
وہ ایک چہرہ جو کھو گیا ہے ہر ایک چہرے میں ڈھونڈھتا ہوں

حسنؔ نے محبت کی ہے، راتوں میں سڑکوں پر آوارگی کی ہے۔ ہر دم مضطرب اور کچھ تلاش کرتے رہنے والا حسنؔ عمر کی نوخیزی میں پڑھنے لکھنے سے بیزار تو اس لیے کرتا تھا کہ سب پڑھتے لکھتے ہیں لیکن پھر اس کے مزاج کا یہ ایک حصہ بن گیا۔ لیکن آج بھی وہ کتابی علم سے نفرت کرتا ہے، اسے زندگی کی کتاب میں سکون ملتا ہے۔ بمبئی کی زندگی، بڑے شہروں کی بدصورت زندگی جس پر ملوں کی چمنیوں سے نکلا ہوا کوئلہ جمتا جا رہا ہے۔

بستی پہ چھایا ہے سایہ غرض کا، بند ہیں سارے دوارے او بابا
کاہے کو نیند اُجاڑے او بابا کاہے کو سب کو پکارے او بابا

کس کو پڑی ہے کہ سننے کو بیٹھے تیرے غموں کی رام کہانی
ہیں سب کے اپنے اپنے بکھیڑے سب ہی یہاں دکھیارے او بابا

جائے کہاں جلتی دوپہریا، کس کو صدا دے سونی ڈگریا
تو بھی جو آ کے سب کی طرح سے سایہ ہی سایہ پکارے او بابا

سپنے ہیں ماٹی کی کچی گگریا، بھرا ہوا ہے حقیقت کا دریا
اک بارسن لے اترنے سے پہلے گہرے بھنور تیز دھارے او بابا

سنیاس لے کر دنیا کو چھوڑا اپنے سے لیکن ناتہ نہ توڑا
جیون تو خود اک تپسیا ہے پگلے سانسوں کی دھونی رمارے او بابا

سوچو اگر تو سونا بھی ماٹی دیکھو اگر تو ماٹی بھی سونا
کھونا بھی پانا، پانا بھی کھونا یہ تو حسن کو بتارے او بابا

☆☆

گزر گئے ماہ و سال لیکن، کبھی کبھی میں یہ سوچتا ہوں
گیا جہاں سے چھڑا کے دامن کوئی، میں اب تک وہیں کھڑا ہوں

یہ زرد پتے، یہ خشک شاخیں، یہ سرد لمحے، یہ گرم آنسو
خزاں کے مارے چمن کی صورت، میں خود بھی جیسے بکھر رہا ہوں

ہوس کی یہ تشنگی نہیں ہے، نظر کی آوارگی نہیں ہے
وہ ایک چہرہ جو کھو گیا ہے، ہر ایک چہرے میں ڈھونڈتا ہوں

حسنؔ مری زندگی ہو جیسے، الم کے ہر حادثے سے خالی
سب اپنے اپنے غموں کے قصّے سنا رہے ہیں، میں سن رہا ہوں

☆☆

ہمیں جانے کس کی تلاش تھی کہ نصیب دربدری رہی
جو ملی تو گردِ سفر ملی، سو اُسی کی ہم سفری رہی

کھڑی ہے سر پہ شبِ غم چلو شراب پئیں
نہ صبح تک ہو نشہ کم چلو شراب پئیں

اب اس کے بعد تو پینا ہے زہر سانسوں کا
ابھی جوان ہے موسم چلو شراب پئیں

نشہ نہ ٹوٹے کہیں دل تو خیر ٹوٹ گیا
ملے گا پھر نہ یہ مرہم چلو شراب پئیں

☆☆

وہ آگ جس کے سہارے جیے ہیں مدت سے
وہ آگ ہوتی ہے مدھم چلو شراب پئیں

زمانہ بھول چکا ہم کو مدتیں گزریں
جہاں کو بھول کے اب ہم چلو شراب پئیں

تمام رات پیا خونِ دل حسنؔ تم نے
اب ایک گھونٹ سحر دم چلو شراب پئیں

☆☆

گلیوں کا شہزادہ

میں گلیوں کا شہزادہ ہوں
کیا جانے کتنی صدیوں سے
ان اونچی نیچی گلیوں میں
بدحال و پریشان پھرتا ہوں
سب آئینہ خانے ٹوٹ گئے
اور پھر بھی میں مجبور رہا
اک ہاتھ بڑھا، سو ہاتھ کھنچے
دنیا کا یہی دستور رہا

میرا دل قدموں کے تلے
روندا بھی گیا، کچلا بھی گیا
میں آہ بھی منہ سے کر نہ سکا
لیکن وہ دن بھی آئے گا
یہ گلیاں سوئی سوئی سی
صدیوں کی نیند سے جاگیں گی
جب یہ دکھ میں کھوئی گلیاں
اپنے دکھ کو پہچانیں گی

جب یہ گلیاں مسکائیں گی
جب گھر گھر کرنیں ناچیں گی
میں ان گلیوں کو کیوں چھوڑوں
یہ گلیاں میرا جیون اور
میں گلیوں کا شہزادہ ہوں

☆☆

کرنوں کا جال پھینکا اُٹھالے گئی مجھے
اک دھوپ روپ کی تھی اُڑالے گئی مجھے

پتھر بنا تو زد پہ رہا ٹھوکروں کی میں
جب خاک ہوگیا تو ہوا لے گئی مجھے

میں شور وغل سے شہر کے گھبرا چلا تھا کچھ
خاموشیوں کی ایک صدا لے گئی مجھے

اور جس کے پیش نظر لارنس کے قول کے مطابق شمیم حنفی نے شاعروں کی موت کا اعلان کر دیا ہے اور انگلستان کے متمول طبقوں اور صنعت کاروں کے اس جُرم کا ماتم بھی کیا ہے کہ انہوں نے اپنے کاریگروں کو بدصورتی اور محض بدصورتی کی تخلیق پر لگا دیا ہے جو مسلسل گھٹیا پن اور بے ہیت اور بدصورت گرد و پیش کی تخلیق کر رہے ہیں۔ بہ قول کامو درد سے بھری تجسیں، قید و بند سے کسمساتی شامیں اور قتل و غارت گری سے بھری دوپہریں اب نئے شہر کا مقدر بنتی جا رہی ہیں۔ گاؤں سے نکل کر جب حسن شہر کی دلدل میں پھنسا تو اپنی عہد ساز معصومی کو کھو بیٹھا اور بڑی جھٹپٹاہٹ کے ساتھ عاجز ہو کر یوں بولا جیسے بالکل ہی لاچار ہو گیا ہے۔

تم کیا جانو میرا جینا، جیتے جی مر جانا ہے
پاپ سے دل کو لاکھ بچالوں پھنس جاتے ہیں ہاتھ مرے

لارنس کی زمین غنائیت کھو چکی ہے مگر ہم اس کے تحفظ میں ابھی بھی سرگرداں ہیں۔ فراق، جوش، فیض، اختر الایمان زندگی کی اس ضرورت کے قائل ہیں اور کیونکہ ان کی شاعری زندگی کی شاعری ہے اس لیے غنائیت کو انہوں نے ہاتھ سے جانے نہ دیا ہے۔ ہمارا شاعر اب بھی بیتی ہوئی کہانیوں کو بہت شدید جذبہ کے ساتھ recreate کر رہا ہے۔ نئی ہلاوتوں میں سنبھال کر رکھی ہوئی قند گھول رہا ہے۔ حسن کمال نے بہت سے گیت لکھے ہیں، اس کے مزاج کی غنائیت دراصل اس کے طبقاتی شعور کی غنائیت کا ہی ایک حصہ ہے۔ ہر طبقہ کے شعور میں بھی ایک غنائیت ہوتی ہے، اس موسیقی اور سر تال کی ایک پہچان ہوتی ہے جو شاعر دانستہ طور پر اپنے طبقے کی غنائیت کا سر کچل کر سپاٹ اور کھردرے پن کو اپنے شعری لہجے میں ٹھونسنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ دراصل قدرت

یوں بھی پڑا ہوا تھا میں بکھری کتاب سا
پھر کیا ہوا کا دوش اُڑا لے گئی مجھے

ساحل پہ درد کے میں اُسے ڈھونڈتا رہا
وہ موج بن کے آئی بہا لے گئی مجھے

کل تک میں اپنے آپ میں موجود تھا مگر
اُس کی نگاہ مجھ سے چرا لے گئی مجھے

آوارگی لکھی تھی مقدر میں جب حسنؔ
میں بھی گیا جدھر یہ صبا لے گئی مجھے

☆☆

تمھیں نہ پانے کا غم ہم بھلا بھی سکتے تھے
جو یہ خیال نہ ہوتا کہ پا بھی سکتے تھے

پوچھتے ہیں سب ہم سے دل لٹا کے کیا پایا
غم سا گوہر یکتا ، تم سا دلربا پایا

وحشت اور سوناپن اپنی ذات تنہائی
آج میکدے کو بھی خانۂ خدا پایا

تم کو کھو کے ہم نے تو غم کی دولتیں پالیں
ہم کو کھو کے پرتم نے یہ بتاؤ کیا پایا

سیکڑوں کی جاں چھوٹی، تیری تیغ تو ٹوٹی
ہم کو سر کا غم ہی کیا، ہم نے خوں بہا پایا

اے حسن کمال آخر یہ بھی کیا بھلا کم ہے
بے حسی کی دنیا میں دل دکھا ہوا پایا

☆☆

ہری ہیں گودیاں پھر کونپلوں سے
درختوں کی دعائیں کام آئیں

کنارے ریت اوڑھے سو رہے ہیں
سمندر کی ہوائیں کام آئیں

زمیں کو دھوپ عریاں کر رہی تھی
گھٹاؤں کی ردائیں کام آئیں

مؤذن خواب غفلت میں پڑے تھے
پرندوں کی صدائیں کام آئیں

تری رحمت کو کیسے آزماتے
بہت اپنی خطائیں کام آئیں

☆☆

شاید جو زہر شہر میں تھا، کام کر گیا
خود سے ملے ہوئے بھی زمانہ گزر گیا

پاگل کوئی اک اک سے یہی پوچھتا تھا کل
ہم سب کا ایک گھر تھا بتاؤ کدھر گیا

سوچا تھا اپنے دل میں سنواروں گا میں تمھیں
تم آئے، تم کو دیکھ کے میں خود بکھر گیا

دُھن تھی کہ زندگی کو سمجھ لینا چاہیے
جب آ گئی سمجھ میں تو بے موت مر گیا

ہر شام کتنے درد سے دیکھا ہے یہ حسن
سورج کا خون پی کے سمندر نکھر گیا

☆☆

فراموده

اب تو
ہلکی سنہری زلف میں شاید
تھوڑی سی چاندی گھل گئی ہوگی،
چہرے کی سرخی، شادابی
تھوڑی تھوڑی دھل گئی ہوگی
حیراں اور معصوم آنکھوں کے نیچے شاید
تھوڑی سی سیاہی جم گئی ہوگی۔۔،
چنچل باتوں شوخ تبسم کی طغیانی
شاید کچھ کچھ تھم گئی ہوگی
جسم کے ٹھوس حصوں کی طنابیں

تھوڑی ڈھیلی پڑ گئی ہوں گی؟
الہڑ پن اور بے فکری میں
شوہر، بچوں اور گھر داری کی الجھن
مہنگائی کے دکھڑے مل گئے ہوں گے
ایک زمانہ بیت گیا
تم کو نہیں دیکھا
اور کیا دیکھوں
میں بھی کتنا بدل گیا ہوں
تیزی، طرّاری، طوفاں خیزی سب بکھر چکی ہے
کتنے خوابوں کو دل کب کا بھول چکا ہے!

☆☆

کے بخشے ہوئے ایک انمول خزانے کو ٹھکرا کر اس کی ناشکری کرتے ہیں اور نہیں جانتے کہ اس نے فانی جیسے عظیم شاعر اسی غنائیت کی خاکستر سے پیدا کیے ہیں۔

ہر موسیقی اپنے طبقاتی شعور کے ساتھ ایک نسلی شعور بھی رکھتی ہے اور اس میں جغرافیائی حد بندی بھی کام کرتی ہیں۔ قدرت بھی اتنے الگ الگ ٹھور ٹھکانوں پر الگ الگ وقتوں میں الگ الگ دھنوں میں گنگناتی ہے۔ اس کو بھی الگ الگ آوازیں الگ الگ لہجہ ہے۔ لہجہ کس طرح نغمہ بن جاتا ہے۔ یہ فن فیض کو خوب آتا تھا۔ ہمارے چاروں طرف مانا کہ بدصورتی بڑھتی جارہی ہے مگر خوبصورتی بھی ابھی زندہ ہے، اور شاید زندہ رہے گی۔ حسن کمال کی نظم ''چاند دن میں'' پڑھ کر اس نازک سی مسرت کا احساس ہوتا ہے۔

حسن کمال کا یہ مختصر سا مجموعہ آپ کے سامنے ہے، میرے ذاتی تاثرات اس مجموعے میں سفر کرتے وقت آپ کی رہبری کے لیے قطعی نہیں ہیں۔ اچھی بات یہ ہے کہ خود شاعر کو بھی اپنے کو منوانے کی جلدی نہیں ہے۔ کیوں کہ آپ نے یہ کہیں نہیں دیکھا ہوگا کہ حسن کمال نے اپنے لیے مضامین لکھوائے ہوں، یا اپنی شاعری کی ہو وہ ہنوز کی منزل میں تھے۔ یہ اس کی خوش قسمتی ہے کہ جس بازار میں شعر صرف کموڈیٹی کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے وہاں بھی وہ چوپڑہ صاحب جیسے سلیقہ مند حساس اور شعر و شاعری کے قدر دان ہدایت کار کے ساتھ منسلک ہے جنہیں ہماری شاعری کی روایت سے بھی پوری واقفیت ہے۔ اور روایت سے بغاوت کے خوبصورت اور دل نشیں تیوروں کو بھی وہ پہچانتے ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ حسن کموڈیٹی پوئٹری لکھتے وقت بھی بہت زیادہ راہ سے بے راہ نہیں ہوگا۔

☆☆☆

غموں کو گر مرے سر کا پتہ نہیں ملتا
میں بچ تو جاتا مگر جاگنا نہیں ملتا

ملا ضرور ہوں پر جانتا نہیں اس کو
کبھی وہ چہرے سے اپنے جدا نہیں ملتا

میں خود کو توڑ کے، بکھرا کے اُس کی اُور بڑھا
وہ مل گیا مگر اپنا پتہ نہیں ملتا

نہ جانے کیا ہوا اچھوں سے بھر گئی بستی
کوئی بھی اپنے سوا اب بُرا نہیں ملتا

ہمیں تو جو بھی ملا وہ خدا ہی بن کے ملا
کہاں ہیں وہ جنھیں کوئی خدا نہیں ملتا

نقاب ڈال لو کوئی کمال چہرے پر
کہ جھوٹ بولے جو وہ آئینہ نہیں ملتا

☆☆

اپنی وجہ بربادی جانتے ہیں ہم لیکن کیا کریں بیاں لوگو
مصلحت پرستی پر ہر قدم ہوا ہم کو جرم کا گماں لوگو

آؤ آزمالیں اب ہم بھی جذبِ دل اپنا ہر طرف یہ چرچا ہے
اس حسین کوچے میں روز سے زیادہ ہے جان کا زیاں لوگو

وقت کی نزاکت کا آج جو تقاضا ہے جرم کل نہ کہلائے
توڑ دو خموشی کے آہنی حصاروں کو کھول دو زباں لوگو

کیا سبب بتائیں ہم نالہ شبانہ کا پوچھ لو اِن آنکھوں سے
اس نگاہِ جادو میں اپنے ہر تبسم کا راز ہے نہاں لوگو

شعر کیا، غزل کیسی، اے حسنؔ یہ وہ فن ہے جس کو کچھ ہی سمجھیں گے
ڈھونڈ پاؤ تو ڈھونڈ وان چھپے اشاروں میں اپنی داستاں لوگو

☆☆

دل لٹے گا جہاں خفا ہوگا
عشق میں جو بھی ہو بھلا ہوگا

شہر کا شہر ہے اُداس اُداس
میرے بارے میں کچھ سنا ہوگا

اپنی بربادیوں کا رنج نہیں
تیری تنہائیوں کا کیا ہوگا

سر اُٹھائے چلے چلو یارو
کوئی تو خنجر آزما ہوگا

ناز ہے اپنی بندگی پہ حسنؔ
جس کو چاہیں وہی خدا ہوگا

☆☆

یہ شامِ الم یہ غم تمھارے
پلکوں میں اُلجھ گئے ہیں تارے

ہیں تلخ یہ روز و شب ہمارے
اے قند لبے سحر نگارے

اک عمر سے ہے یہ آس، کوئی
ہم کو ترے نام سے پکارے

ہم دور کہ جیسے جسم و سایہ
ہم پاس کہ جیسے دو کنارے

بدحالِ خرابِ ما نظر کن
آرامِ دل و جگر نگارے

پینے نہیں دیں گے شیخ صاحب
جینے نہیں دیں گے ماہ پارے

پلٹے نہ وہ میر کی ڈگر سے
ہم لاکھ حسنؔ حسنؔ پکارے

☆☆

کتنی مشکل سے بہلا تھا یہ کیا کر گئی شام
ہنستے گاتے دل کو پل میں تنہا کر گئی شام

☆☆

ایک نظم

آنکھوں نے اک پیام سنایا ضرور تھا
انکار چاہے لاکھ کرو آج تم مگر
اِک درد تم نے دل میں جگایا ضرور تھا
جانے وہ بے خیالی تھی یا جان بوجھ کر
آنچل ہماری سمت اُڑایا ضرور تھا
کرنا نہ چاہو یاد تو یہ اور بات ہے
ورنہ تمھیں بھی یاد کچھ آیا ضرور تھا
اب کہہ رہے ہو خواب نہیں کم عذاب سے
خود تم نے ایک خواب دکھایا ضرور تھا

☆☆

من آنم کہ من دانم

حسن کمال

لکھنؤ نے پھر وہ دن کبھی نہ دیکھے۔ اس لیے نہیں کہ اُن دنوں کے لکھنؤ میں ہم ہوا کرتے تھے، بلکہ اس لیے کہ اُن دنوں کے لکھنؤ میں ایک ساتھ اردو ادیبوں، شاعروں کی چار چار نسلیں بیک وقت اکٹھا تھیں۔ پھر کبھی ایسا نہیں ہوا۔ یہ ۱۹۵۰ء کے اواخر اور ۱۹۶۰ء کے اوائل کا لکھنؤ تھا۔ پہلی نسل میں علی عباس حسینی، حیات اللہ انصاری، اختر حسن تلہری، آنند نرائن ملا اور پروفیسر احتشام حسین تھے، چاہیے تو اسی صف میں بنّے بھائی (سجاد ظہیر) اور انکی بیگم رضیہ سجاد ظہیر کو بھی شامل کر لیجیے۔ دوسری صف میں رام لال، منظر سلیم، ستیش بترا اور بشیر پردیپ کھڑے تھے۔ تیسری نسل حسن شہیر، عابد سہیل، م۔ نسیم، قیصر تمکین، مشیر علوی، اقبال مجید، احمد جمال پاشا، عثمان غنی، رتن سنگھ، شارب ردولوی، شکیب سیتا پوری اور احراز نقوی پر مشتمل تھی اور اس کے بعد والی نسل میں ہم، آفتاب اختر، والی آسی، وقار پاشا، انور کمال آفریدی اور عمر برادران یعنی شوکت اور اقبال عمر اور کئی اپنی ہی عمر کے لوگ

''جہان آباد''

(وہ ضلع جس میں لکشمن پور باٹھے گاؤں ہے، جہاں رن ویر سینا
نے ۵۷ دلت مرد، عورتوں اور بچوں کو بھون ڈالا)

نہیں تم جھوٹ کہتے ہو
بھلا یہ کیسے ممکن ہے
کہ اس بے جان خطّے کو
جہان آباد کہتے ہوں
نہیں یہ ہو نہیں سکتا

جہان آباد کا مطلب تو وہ دنیا ہے
جس میں زندگی آباد ہوتی ہے
جہاں ہلچل ہو، رونق ہو
جہاں گلشن، ہو محفل ہو
جہاں پر حسن ہو، خوشبو ہو، نغمہ ہو
جہاں بازار ہوں، گلیاں ہوں، چوپالیں ہوں، پنگھٹ ہوں
جہاں شاداب ہونٹوں پر
رسیلے گیت بن کر پھول کھلتے ہوں
جوانی کا ترنم ہو، بہاروں کا تبسم ہو
کنوارے قہقہوں کا نور بکھرا ہو
بزرگوں کی دعاؤں کے چراغوں کا اُجالا ہو
جہاں پر زندگی کا بول بالا ہو

یہ کس بستی میں لے آئے ہو تم
اس کو جہاں آباد کہتے ہیں

نہیں بھائی!
یہاں تو ہر طرف لاشیں بچھی ہیں، بے کفن لاشیں
یہاں تو مردنی چھائی ہوئی ہے
ہوا میں خون کی بدبو
زمیں پر خون کے دھبّے
یہاں تو ہر طرف بس مکھیوں کی بھنبھناہٹ ہے
نہیں تم کو غلط فہمی ہوئی ہوگی

جہان آباد اس کو طنزیہ کہتے رہے ہوں گے
یہ لاشہ جو نظر آتا ہے یہ بھی
کسی انسان کا لاشہ نہیں ہے
یہاں تاریخ کے شاید کسی بھی دور میں
انساں نہیں رہتے تھے، گر رہتے
تو ٹی وی کے کسی چینل پہ اُن پر تبصرہ ہوتا
کسی اخبار میں تصویر چھپتی،
محفلوں میں بحث ہوتی
دفتروں میں تذکرہ ہوتا
نہیں بھائی

یہاں انساں نہیں شاید کبھی جاندار رہتے تھے
وہ مفلس اور فاقہ کش
دلت کہلاتے تھے، انسانیت اُن سے گریزاں تھی
وہ جب زندہ تھے تب بھی
اُن کی یہ بستی جہاں آباد کب تھی
زندہ انسانوں کا قبرستان لگتی تھی
ذرا تم اپنی معلومات میں ترمیم کرلو
اس جہان آباد کا ہم سے، ہماری شادماں دنیا سے
کوئی بھی تعلق،

کوئی رشتہ
کوئی ناتہ ہی نہیں ہے
نہیں بھائی
تمھیں شاید غلط فہمی رہی ہوگی!

☆☆

ہر اک فضا سے، ہر اک شے سے جو خفا سا لگے
نہ جانے کیوں مجھے وہ آدمی بھلا سا لگے

نگاہ پارہ، دل آوارہ، شوق بنجارہ
کوئی بھی ایسا ملے مجھ کو آشنا سا لگے

اُسے جو دور سے دیکھوں تو میرا اپنا ہے
اُسے قریب سے دیکھوں تو دوسرا سا لگے

وہ میرا کون ہے یہ تو خبر نہیں لیکن
اُسے بُرا کہے کوئی مجھے بُرا سا لگے

میں آئینے میں اُسے کب سے ڈھونڈتا ہوں حسنؔ
جو مجھ میں ہے تو سہی مجھ سے پر چھپا سا لگے

☆☆

بے وفا، نامہرباں، یہ سچ ہے وہ ایسا تو تھا
مت کہو کچھ اُس کو یارو جو بھی تھا میرا تو تھا

بھیڑ اتنی ہے نگر میں کس جگہ ڈھونڈوں اسے
ایک چہرہ کچھ دنوں پہلے، کہیں دیکھا تو تھا

رات آئی اور آکر مجھ کو تنہا کر گئی
کم سے کم دن تھا تو میرے ساتھ اک سایہ تو تھا

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

شامل تھے، جن میں قدر مشترک یہ تھی کہ سب کے سب کسی نہ کسی دوشیزۂ پری جمال کے عشق میں گرفتار تھے۔ کچھ کے عشق اسی زمانے میں ناکام ہو چکے تھے، کچھ کے چند برس بعد ناکام ہو گئے۔ لکھنؤ کا اولڈ انڈیا کافی ہاؤس دانشوروں، صحافیوں اور ہندی کے چند جید لیکھکوں (یشپال، امرت لال ناگر، اِلا چندر جوشی وغیرہم اور سب سے نمایاں ہمارے بلٹز والے بشن بھائی) کا غیر سرکاری صدر دفتر ہوا کرتا تھا، جہاں اگر اللہ نے توفیق دی ہو تو کافی کی ایک پیالی (قیمت چار آنہ) اور چار مینار سگرٹ کی ایک ڈبیہ (قیمت ڈھائی آنہ) پر آپ سارا دن گزار سکتے تھے، کسی کی مجال نہیں تھی کہ پوچھ سکے کہ ''کام دھندہ ہے یا نہیں؟''

ہر پندرہ دن میں ایک بار کسی نہ کسی کے گھر پر ایک ادبی نشست ہوا کرتی تھی، جس میں کسی ایک افسانہ نگار کو اپنا افسانہ سنانا ہی ہوتا تھا اور اس افسانہ پر تنقید کے نام پر وہ لے دے مچتی تھی کہ توبہ بھلی پھر منہ کا مزا بدلنے کے لیے شاعری کا دور بھی چلتا تھا، خوش قسمتی سے اس پر کوئی تنقید نہیں ہوتی تھی۔ ایک بار ایسی ہی ایک نشست میں بلراج مینرا پہلی بار اپنا افسانہ لے کر دلی سے لکھنؤ آئے، انہوں نے اپنا افسانہ سنایا۔ صدارت حیات اللہ انصاری فرما رہے تھے۔ اُن کا افسانہ ختم اور تنقید کی ابتدا ہوئی تو بولنے والوں میں پہلا نمبر ہمارا تھا۔ ہم نے حیات اللہ انصاری کے اشارے پر بلراج مینرا پر ویسا ہی حملہ کیا جیسا بابر نے ابراہیم لودی پر کیا تھا۔ اس کے بعد تو باقی سب نے افسانے کے چیتھڑے اڑا دئے اور جب بلراج مینرا کو صفائی دینے کا موقع دیا گیا تو ان کے منہ سے بس اتنا نکلا کہ ''بھائی خوب ہے لکھنؤ اور خوب ہیں لکھنؤ کے لوگ''۔ اختتام چائے اور

ہم حسن کو جانتے ہیں آدمی اچھا نہ تھا
دو گھڑی کو پاس آ کر دل کو بہلاتا تو تھا

☆☆

دور پہاڑی کی چوٹی پر روتی رہ گئی دھوپ
رات اندھیرے سے دنیا کا سودا کر گئی شام

کیسے کیسے دوستوں سے محفل آرائی رہی
زندگی بھر ساتھ اپنے پھر بھی تنہائی رہی

کیا گلہ اُن سے اچانک اجنبی جو بن گئے
عمر بھر خود سے بھی اپنی کب شناسائی رہی

اور تو سب ہم سفر اس راہ میں چھٹتے گئے
ہر قدم بس ساتھ اپنی آبلہ پائی رہی

شہرتوں کے واسطے کیا کیا کیا احباب نے
اپنے حصے میں خدا کا شکر رسوائی رہی

ہم کہ تھے نا آشنا سب کی نگاہوں میں حسنؔ
اک نظر تھی آشنا، سو وہ بھی شرمائی رہی

☆☆

آخری خواہش

زمیں جاگی
فلک کانپا
فضائیں جگمگا اُٹھیں
مقدس آسمانی فلسفوں کے کارواں اُترے
نبی آئے
رشی آئے
سمندر نے سفینوں کے لیے آغوش وا کر دی

زمیں سے تیر اٹھے
آسماں کے سخت سینے میں
کئی سوراخ کر ڈالے
خلائیں بس گئیں
کسی نے اُٹھ کے چپکے سے
چمکتے چاند کے ماتھے پہ اک بوسہ دیا
لیکن
رگوں میں دوڑتی وحشت یوں ہی زندہ رہی پھر بھی
مذاہب کند چھریاں لے کے لپکے

مقدس سب کتابیں قتل کا فرمان بن بیٹھیں
ارسطو مر گیا
سر جھک گیا سب دیوتاؤں کا

خدا خاموش ہو کر رہ گیا
نہ کوئی بچ سکا ایسا
کہ جس سے ہم مدد مانگیں
چلو اب یوں کریں ہم تم
مقدس سب کتابیں ادب سے چوم کر اک طاق پر دھر دیں

کہیں سر جوڑ کر بیٹھیں
عجب کیا ہے
کہ کچھ جینے کی صورت ہی نکل آئے
ہمارے دل کی قبروں سے محبت ہی نکل آئے!

☆☆

تو ہنس دے تو دھوپ کھلے، تو رو دے، ہو برسات
چلتے ہیں مرے دیس کے موسم گوری تیرے ساتھ

اس میلے میں آ کر اکثر کھو جاتے ہیں لوگ
بھیڑ بہت ہے دنیا میں، لے تھام لے میرا ہاتھ

تیری بزم سے چن کر لائے سب خوشیوں کے پھول
ہم بھی گئے پر ہم نے پائی اشکوں کی سوغات

گلی گلی اب تیرے حسن کے قصے ہیں مشہور
ہم پچھتائے جگ سے کہہ کر اپنے دل کی بات

اب تک جیسے بجلی سی ہے نس نس میں موجود
بھولے سے ہم چھو بیٹھے تھے اک دن تیرا ہاتھ

☆☆

کم سے کم مِل کے بچھڑنے کا نہ کھٹکا ہوتا
کاش بس میں نے تجھے خواب میں دیکھا ہوتا

عمر بھر ساتھ تو رہتی تری یادوں کی کسک
کیا بُرا تھا کہ مرا زخم نہ اچھا ہوتا

اب تو میں دیکھ بھی سکتا نہیں محفل میں تجھے
مجھ پہ خود راز مرا کاش نہ افشا ہوتا

حسبِ حال میزبان ناشتے پر ہوتا تھا۔ چنانچہ اگلی نشست کا قرعہ جس کے نام نکلتا تھا، وہ اسی دن سے نہ صرف نئے افسانے کی تخلیق بلکہ چائے پانی کے انتظام میں بدحواس پھرتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ یہ اُس وقت کا لکھنؤ تھا، جب عرب اور خلیجی ملکوں نے نہ تیل دیکھا تھا، نہ تیل کی دھار کہ انہیں صاحب اوصاف انجینئروں اور ڈاکٹروں کے علاوہ دھوبیوں، نائیوں، بھشتیوں اور منشیوں کی بھی اچانک ضرورت آن پڑی ہو۔ یہ اُس وقت کا لکھنؤ تھا، جو دوسری جنگ عظیم کی ابتلا سے آزاد نہیں ہوا تھا اور پڑھے لکھے یعنی گریجویٹ نوجوان بھی یہ سوچتے تھے کہ اگر سکریٹریٹ کی اپر ڈیویزن کی کلرکی مل جائے تو تقدیر نگوں ہو جائے۔ چنانچہ جو چند برسر روزگار تھے بھی، وہ یا تو کلرک تھے یا پھر کسی اخبار میں ملازم، جہاں صحافیوں کی تنخواہیں کلرکوں کی تنخواہوں سے شرما کے آنکھیں ملاتی تھیں۔ لیکن یہ ماحول ادب خصوصاً افسانے اور شاعری کے لیے نہایت موزوں تھا، چنانچہ اگر اس ماحول میں بھی ہم شاعری نہ کرتے تو بخدا زندگی بھر کچھ اور کر ہی نہیں سکتے تھے۔

شاعری کی ابتدا بیت بازی سے ہوئی تھی۔ جس اسکول میں پڑھتے تھے اس کا اصلی نام تو ممتاز دارالیتٰمی تھا۔ لیکن چونکہ سارے کے سارے طالب علم یتیم و یسیر نہیں تھے، اس لیے احتیاطاً ممتاز ہائر سیکنڈری اسکول رکھ دیا گیا تھا۔ اسی میں ایک مشفق اور فرشتہ صفت استاد ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ملے، جو صرف مارتے نہیں تھے، ہمیں اچھے اچھے شعر یاد کرنے کی تلقین بھی کرتے تھے۔ شجاعت صاحب نے ہماری زندگی پر جو نقش چھوڑا ہے وہ تو شاید قبر میں بھی ہمارے ساتھ جائے گا۔ ان ہی کی مہربانیوں سے ہم نے اتنے اشعار یاد کر لیے (اللہ جھوٹ نہ بلوائے تو ہزاروں کی تعداد میں) کہ پہلے اپنی

موج کیا چیز ہے اور ریت گھروندا کیا ہے
جان لیتے تو نہ ساحل پہ تماشا ہوتا

وہ تو اچھا ہوا شیشے کی طرح ٹوٹ گیا
دل اگر سینے میں ہوتا بھی تو جلتا ہوتا

ہم سے اک شوخ نظر کہہ کے گئی ہے یہ حسنؔ
ہم نہ ہوتے تو ادھورا ترا قصہ ہوتا

دیکھ تو لیتے تھے جی بھر کے تجھے ہم کل تک
رازِ دل کاش ذرا اور چھپایا ہوتا

تجھ کو دیکھوں تو کوئی دیکھ نہ لے جان نہ لے
راز کھلتا نہ یہ ہر وقت کا دھڑکا ہوتا

☆☆

مری زندگی کی اُداسیوں میں دیے سے کون جلا گیا
مجھے خود بھی ہو نہ سکی خبر وہ دل و دماغ پہ چھا گیا

مرا دل تھا گم اسی سوچ میں مری زندگی میں کمی ہے کیا
تبھی ایک جھونکا شریر سا ترا نام لے کے چلا گیا

یہ تھی آرزو کہ کوئی ملے تو فسانۂ غم دل کہوں
مرے ہونٹ کانپ کے رہ گئے وہ ملا تو کچھ نہ کہا گیا

☆☆

خوشبو لٹا گئی ہوا، پھول کھلا گئی ہوا
ہم کہ غبارِ راہ تھے، ہم کو اُڑا گئی ہوا

ہو کے چمن سے آئی تھی، نکہتِ گل بھی لائی تھی
آئی جو میرے شہر میں خوں میں نہا گئی ہوا

ہم تو کسی کی بزم میں ایسا چراغ تھے جسے
شام جلا گیا کوئی، صبح بجھا گئی ہوا

☆☆

کس کو خبر کدھر گیا، کس کو یہ فکر کیا ہوا
پتہ وہ ایک شاخ سے جس کو گرا گئی ہوا

صبح کے انتظار میں جاگے جو رات رات بھر
ایسا تھکے کہ صبح دم ان کو سلا گئی ہوا

درد کی ایک موج سی دل میں مچل گئی حسنؔ
جانے کدھر سے آئی، کیا یاد دلا گئی ہوا

☆☆

تم ہوتے تو.....

جس روز کہ ہم جدا ہوئے تھے
محشر کے سماں بپا ہوئے تھے

چلتا ہوا وقت تھم گیا تھا
آنکھوں میں لہو سا جم گیا تھا

سینے میں چتا دہک رہی تھی
خاموش نظر سسک رہی تھی

فرقت کی گھڑی جب آ رہی تھی
جاں جسم سے نکلی جا رہی تھی

لگتا تھا سفر کی انتہا ہے
جینے کے لیے بچا ہی کیا ہے

لگتا تھا کہ اب نہ جی سکیں گے
اس زخم کو ہم نہ سی سکیں گے

اور اب جو گزر گئے زمانے
یاد آتے ہیں جب وہ دن پرانے

وہ زخمِ جدائی بھر چکا ہے
وہ دورِ جنوں گزر چکا ہے

ہم تم بھی بچھڑ کے جی رہے ہیں
امرت ہو کہ زہر پی رہے ہیں

☆☆

اب جی کا نہیں وہ حال پھر بھی
آتا ہے یوں ہی خیال پھر بھی

اتنے نہ یہ دن اُداس ہوتے
ہم تم اگر آج پاس ہوتے

کتنی ہی سیاہ رات ہوتی
تم ہوتے تو اور بات ہوتی

☆☆

گیت

گھنٹہ بھر چھم چھم برس گئے بادل
برس گئے بادل

شاخوں کے ہونٹوں سے دھول گرد کھینچ کے
الھڑ درختوں کو بانہوں میں بھینچ کے
دھرتی کی چولی کو کس گئے بادل
برس گئے بادل

لمبی پگڈنڈی کو دیکھا مچل گئے
میڑھوں پر چڑھنے کی دُھن میں پھسل گئے
کھیتوں میں ہاتھ ہاتھ دھنس گئے بادل
برس گئے بادل

جماعت کی پھر اسکول کی بیت بازی ٹیم میں شامل ہوئے اور ٹیموں میں شمولیت کا یہ سلسلہ یونیورسٹی تک چلتا رہا۔ درجنوں کپ اور تمغے حاصل کیے، جو محلے اور خاندان میں ہماری شہرت کا باعث بنے۔ بیت بازی کے سبب ذہن میں شعر سازی کا سانچہ یعنی موزونیت اور ناموزونیت کا امتیاز اپنے آپ پیدا ہو گیا۔ دو ایک شعر کہے بھی، لیکن سناتے کس کو؟ ہمت ہی نہیں پڑتی تھی۔ بڑے سوچ بچار کے بعد خیال آیا کہ ہماری نانی محترمہ کا ادبی ذوق نہایت اعلیٰ ہے اور انہیں شعر و شاعری سے لگاؤ بھی کافی ہے، کیونکہ وہ بات بات پر یہ شعر پڑھا کرتی تھیں کہ۔

رائیں ریاں لگائے گھن چکر میں نے ماری پہاڑ سے ٹکر

ہمیں رائے ریاں کا مطلب نہ اُس وقت معلوم تھا، نہ اب معلوم ہے، لیکن ہم اپنی نانی مرحومہ کے ادبی ذوق سے بہت مرعوب تھے۔ چنانچہ ہم نے ہمت کر کے اپنے شاعر ہونے کی نوید انہیں سنا ہی دی اور ساتھ میں دو ایک شعر بھی۔ چونکہ نانی مرحومہ نے اشعار کی موزونیت یا ناموزونیت پر کوئی تبصرہ نہیں کیا، اس لیے ہمیں ہر چند کہ وہ اشعار یاد نہیں رہے، لیکن آج تک یہ یقین ہے کہ وہ نہایت موزوں ہی نہیں بلکہ اعلیٰ درجے کے اشعار رہے ہوں گے، کم از کم رائیں ریاں والے شعر کے ہم پلہ تو ضرور رہے ہوں گے۔ ورنہ نانی مرحومہ تعریف کیوں کرتیں؟ پھر ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ ہمارے اندر اگر اسد اللہ خاں غالبؔ بننے کے امکانات نہیں بھی ہوں تو کم از کم مولانا الطاف حسین حالیؔ بننے کے امکانات تو بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ ہوا یہ کہ ہمارے اسکول میں پہلی بار ایک آل انڈیا مشاعرے کا اہتمام ہوا۔ جس میں جوشؔ ملیح آبادی اور

برساتی، چھتری، ٹاٹ، بورے نکال کے
موٹر کے پہیوں سے کیچڑ اچھال کے
ریلوں کی پٹری میں پھنس گئے بادل
برس گئے بادل

کھولی کے پردے چٹائی بکھیر کے
ساجن کی محنت پہ پانی سا پھیر کے
گاڑھی کمائی کو ڈس گئے بادل
برس گئے بادل

دفتر کی فائل سے دل کو نکال کے
آنکھوں کو گگن چھتج ادھر اُدھر ڈال کے
روکھے پھیکے جیون پہ ہنس گئے بادل
برس گئے بادل

☆☆

گیت

کچھ بھی نہیں ہوگا
کل تم بھی ہنسو گی،
کل میں بھی سب یاد کر کے ہنس دیا کروں گا
کچھ بھی نہیں ہوگا

بالوں میں دھوپ ڈال دے گی لکیریں
چہرے پر وقت کے نشان جم جائیں گے
پاگل محبت کے پرشور جھرنے
عمر کی ترائی میں جا کر تھم جائیں گے
یادیں تو ہوں گی پر درد نہیں ہوگا
تم بھی ہنسو گی اور میں بھی سب یاد کر کے ہنس دیا کروں گا
کچھ بھی نہیں ہوگا

فکروں کی بھیڑ میں یادیں کھو جائیں گی
جیون کی دھول سے گھاؤ بھر جائیں گے
آنکھوں میں بسے ہوئے سپنے دھندلائیں گے
آنسو بجھ جائیں گے، جذبے مر جائیں گے
اپنی پہچان کا جب ذکر کہیں ہو گا،
تم بھی ہنسو گی اور میں بھی سب یاد کر کے ہنس دیا کروں گا
کچھ بھی نہیں ہو گا

☆☆

دنیا میں بعض لوگ ایسے بھی پیدا ہوتے ہیں جو ہمہ جہت صفات کے حامل ہوتے ہیں۔ حسن کمال بھی ایک ایسی ہی شخصیت کا نام ہے۔ باوجود اس کے کہ حسن کمال نے فلم رائٹنگ اور صحافت کو بطور پیشہ اختیار کیا اور دونوں میں بے شک اپنا ایک الگ مقام بنایا ہے لیکن اُن کی بڑی خوبی یہ ہے کہ فلمی دنیا ہو، ادب یا صحافت، ہر جگہ حسن کمال ایک معروف نام ہے۔ حالاں کہ شاعری کی ابتدا وہ اپنی پیشہ ورانہ زندگی کے آغاز سے پہلے ہی کر چکے تھے اور اس میں خاصے کامیاب بھی تھے لیکن اُن کی پیشہ ورانہ مصروفیات نے جہاں زندگی کی آسانیاں فراہم کرنے میں مدد کی وہیں اس نے سب سے زیادہ نقصان ان کی شاعری کو پہنچایا کہ اس طرف توجہ کم کم رہی، پھر مزاج کی بے نیازی نے 'مرے پرسو دُرے اور' کا کام کیا۔ اسی لیے وہ اس کی طرف سے قدرے غافل بھی رہے۔ اُن کا یہ مختصر سا شعری مجموعہ اس حقیقت کا ثبوت ہے۔ گذشتہ چالیس برسوں سے شاعری کرنے کے بعد اپنے معیار کی کسوٹی پر چھان پھٹک کے جو اُن کے ہاتھ آیا وہ یہی ہے۔ یعنی اُن کا یہ پہلا شعری مجموعہ جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ جب کہ اُن کے ساتھیوں میں کتنے ہی ایسے ہیں جن کی اس عرصے میں کئی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ میری دیرینہ خواہش تھی کہ حسن کمال کا شعری مجموعہ شائع ہو۔ انھوں نے اس کی اشاعت کی ذمہ داری قلم پبلی کیشنز کو سونپ کے میری خوشی کو دوچند کیا ہے۔ اس کے لیے میں اُن کا ممنون ہوں۔

الیاس شوقی

جگر مرادابادی آنے والے تھے۔ سارے شہر میں مشاعرے کا چرچا تھا۔ مشاعرہ مقامی اور چھوٹے موٹے شاعروں کے لیے (شاید اُن کی تعداد کم کرنے کی نیت سے) طرحی رکھا گیا اور آل انڈیا قسم کے شاعروں کے لیے غیر طرحی۔ مصرعہ طرح تھا ''جو آدمی کے نہ کام آئے آدمی کیا ہے''۔ استاذی شجاعت صاحب کا حکم ہوا کہ اس میں اپنے اسکول کی نمائندگی ہم کریں گے اور مزید حکم ہوا کہ نمائندگی کا جواز مہیا کرنے کے لیے مذکورہ طرح میں غزل بھی کہیں گے۔ ہماری روح فنا ہوگئی، بیت بازی کے لیے یاد کیے ہوئے سارے اشعار اچانک ذہن کی سلیٹ سے یوں صاف ہو گئے جیسے بھیگا ہوا کپڑا پھیرنے سے میز کی گرد صاف ہو جاتی ہے۔ شجاعت صاحب سے انکار کے انجام کا خیال بدن میں کپکپی پیدا کر رہا تھا تو مصرعہ طرح کے پہاڑ سے ''اپنی'' غزل کی جوئے شیر نکالنے کا خیال روح میں لرزہ پیدا کر رہا تھا۔ خوش قسمتی سے شجاعت صاحب صرف سخت گیر نہیں نہایت شفیق بھی تھے، وہ ہماری لرزیدگی بھانپ گئے اور انہوں نے فرمایا ''گھبراؤ نہیں ہم ہیں نا، تم غزل لکھو ٹھیک نہ ہوئی تو ہم ٹھیک کر دیں گے''۔ جان میں جان آئی۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ بات مشاعرے سے کوئی دس بارہ دن پہلے کہی گئی تھی۔ باقی دس بارہ دن ہماری زندگی کے سخت ترین دن ثابت ہوئے۔ ہر کام سے دل اُچٹ گیا، کورس کی کتابوں سے بھی، خیر اُن سے تو یوں بھی اُچٹا رہتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گھر پر ٹیوشن پڑھانے والے اپنے نہایت چھڑی پسند ٹیوٹر جناب واحد حسین صاحب عرف ہڈ ماسٹر سے تقریباً روزانہ اور بے تحاشا پٹائی کے علاوہ راتوں کو نہایت ڈراونے خواب دیکھنے کی سزا ملتی رہی۔ خدا خدا کر کے چار پانچ شعر ہوئے اور ہم شجاعت صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

اس بار ڈر نہیں تھا، اس لیے کہ ہم نے شعر تو بہر حال کہہ لیے تھے، کیا ہوا جو مطلع نہیں تھا اور کیا ہوا جو غلط ہونگے، شجاعت صاحب ہیں نا۔ ایک طرح کا احساس تفخر بھی تھا کہ ہم نے شجاعت صاحب کے حکم کی تعمیل بھی کی۔ شجاعت صاحب نے ہماری نہایت خراب ہینڈ رائٹنگ میں لکھی غزل دیکھی اور ہماری طرف مسکرا کر دیکھا۔ ہمیں یاد نہیں کہ اس سے پہلے کب انہوں نے ہمیں مسکرا کر دیکھا تھا، ہاں اس کے بعد انہوں نے دوسری بار ہمیں مسکرا کر اس دن ضرور دیکھا تھا، جب ہم اردو بلٹز کے ایڈیٹر بننے کے بعد انہیں سلام کرنے گئے تھے۔ انہوں نے غزل دیکھ کر کچھ کاٹ چھانٹ اور کمی زیادتی کی۔ لیکن ایک شعر میں کوئی ترمیم نہیں کی بلکہ زور زور سے سر بھی ہلایا، شاید اسی لیے باقی سب شعر تو حافظے سے محو ہو گئے شجاعت صاحب کا سر ہلانا اور وہی شعر یاد رہ گیا۔ شعر یوں تھا ؎

خدا کی یاد تو ہر خاص و عام کرتا ہے
لگن نہ دل کی ہو جس میں وہ بندگی کیا ہے

رات کو مشاعرہ ہوا اور ہم نے جوشؔ و جگرؔ کی موجودگی میں اپنی غزل پڑھی۔ اسکول کے ساتھیوں نے زبردست داد دی، ہم نے دیکھا تو نہیں مگر جوشؔ اور جگرؔ صاحبان نے بھی یقیناً داد دی ہوگی کہ اس زمانے کے شعراء آج کل کے مشاعرہ باز شاعروں کی طرح نہیں ہوتے تھے کہ کسی دوسرے کے اچھے شعر کی داد بھی اس ڈر سے نہیں دیتے کہ کہیں اُس شاعر کی مشاعروں میں مانگ نہ بڑھ جائے۔ ہم ملنے والی داد کے نشے میں ایسا مست ہوئے کہ یہ بھی یاد نہیں کہ جگر اور جوش نے کیا پڑھا۔ پڑھا بھی یا نہیں۔

اس مشاعرہ نے ہماری دنیا ہی بدل دی، مشاعرہ میں ماسٹر بدّو بھی موجود تھے

، اگلے روز وہ ٹیوشن دینے آئے تو چھڑی کے بجائے ہمیں ہاتھ سے پیٹا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ہماری پیٹھ تھپتھپا رہے تھے۔ سارے محلے میں ہمارے سند یافتہ شاعر ہونے کی دھوم مچ گئی۔ حالاں کہ محلے میں صرف دس بارہ گھر مسلمانوں کے تھے، لیکن محلے کے ہندو بھی، آج ہی کی طرح کم سے کم اردو شاعری کے بارے میں خاصے سیکولر واقع ہوا کرتے تھے۔ گھر اور خاندان میں بھی ہمارے مرتبہ میں اتنا اضافہ بہر حال ہوا کہ ''نالائق تو ہے، مگر شاعری کر لیتا ہے''۔ مگر اب ایک نئی مصیبت کھڑی ہوگئی۔ خاندان کی کسی بھی تقریب میں ہم سے شعر سنانے کی فرمائش ہونے لگی۔ پہلے پہل تو خود کو ملنے والی اس اچانک اہمیت سے جی بڑا خوش ہوا۔ لیکن کچھ دنوں بعد فرمائش خفت کا باعث بننے لگی۔ ایک ہی غزل کتنوں کو اور کب تک سناتے۔ پھر تو یہ عالم ہوا کہ لوگ فرمائش ضرور کرتے، وہ نہ کرتے تو ہماری والدہ ضرور کرواتیں، لیکن ہمارے اشعار سن کر اسی بے نیازی سے پیش آتے، جس طرح آج کل وہ لوگ پیش آتے ہیں، جن کے سامنے غیر انگریزی داں والدین اپنے انگلش میڈیم میں پڑھنے والے بچوں سے ''انگلش کی پوئم'' ٹوئنکل ٹوئنکل لٹل اسٹار اور بابا بلیک شیپ'' سنانے کی فرمائش کرتے ہیں اور انکی انگریزی دانی کی تحسین چاہتے ہیں۔ سامعین ایک ایسی مسکراہٹ سے داد دیتے ہیں، جس کی تعریف آج تک بیان نہیں کی جا سکی ہے۔

چنانچہ ہم کو یہ فکر ہوئی کہ کہیں ایک ہی غزل سنتے سنتے ہمارے رشتہ دار ہم کو اور ہمارے ڈر سے ہمارے گھر والوں کو بلانا ہی نہ بند کر دیں۔ اس لیے ہم نے کچھ اور اشعار کہنے کی جرأت کر ڈالی۔ لیکن چوں کہ ان اشعار میں شجاعت صاحب کی ''ہم ہیں

© جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

HAASIL YAHEE
An Urdu Poetry Collection
of
HASAN KAMAL
First published in Nov 2005

نام کتاب:	حاصل یہی
شاعر :	حسن کمال
سرورق :	محمد فیصل صدیقی
اشاعت :	نومبر ۲۰۰۵ء
تعداد :	۵۰۰
قیمت :	۱۵۰؍ روپے

تقسیم کار

قلم پبلی کیشنز: ۷/۱۷/۱۱ ایل، آئی، جی کالونی پائپ لائن روڈ، کرلا (مغربی) ممبئی ۴۰۰۰۷۰
مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ: ممبئی، دہلی، علی گڑھ
سیفی بک ایجنسی: ۱۱/ امین بلڈنگ، ابراہیم رحمۃ اللہ روڈ، ممبئی ۴۰۰۰۰۳

(بھاوے پرنٹنگ پریس ممبئی میں طبع ہوئی)

نا'' شامل نہیں تھی، اس لیے ان پر پہلی غزل جیسی خاطر خواہ داد نہ مل سکی۔ پھر ہمیں ایک ترکیب سوجھی۔ ہم مجمع اور اس کی ادبی معلومات کا اندازہ لگا کر دوسروں کے اشعار اپنے نام سے سنانے لگے۔ ایک بار تو چند لوگوں کو فراق گورکھپوری کی مشہور غزل ؎

زہے آب و گل کی یہ کیمیا، ہے چمن کہ معجزۂ نمو
نہ خزاں ہے کچھ، نہ بہار کچھ وہی خار و خس وہی رنگ و بو

بھی اپنے نام سے سنا ڈالی ''مگر یہ خیریت گزری وہ اردو کم سمجھتے تھے''۔ اور اشعار اور غزلیں تو ٹھیک تھیں، مگر یہ غزل اپنے نام سے سنا کر ہم پر ایک عجب احساس جرم طاری رہا۔ کچھ آنکھوں کو اپنی طرف عجیب نظروں سے دیکھتے ہوئے پا کر یہ ڈر ضرور لگا کہ یہ چوری کسی نہ کسی دن پکڑی جائے گی۔ توبہ کی کہ آئندہ کبھی ایسا نہیں کریں گے۔ یہ احساس جرم برسوں طاری رہا۔ ہم اس سے پیچھا چھڑانے کی بہت کوشش کرتے رہے، لیکن یہ کمبخت پیچھا ہی نہیں چھوڑتا تھا۔ اس نے برسوں بعد ہمارا پیچھا اُس دن چھوڑا جب جے پور کے ایک مشاعرے میں ہم نے ایک نوجوان شاعر کو اپنی غزل ''یقین ٹوٹ چکا ہے، گمان باقی ہے'' اُس کے نام سے لہک لہک کر پڑھتے سنا۔ دل کو ایک عجیب خبیثانہ مسرت ہوئی کہ ہم نے تو کم از کم اردو کے ایک عظیم شاعر کی غزل اپنے نام سے سنا دی تھی، مگر اس کمبخت نے تو اعلیٰ، ادنیٰ کا بھی خیال نہیں کیا۔ بہر کیف اُس دن کے بعد سے ہم نے تہیہ کر لیا کہ شعر اپنا ہی سنائیں گے چاہے داد ملے یا نہ ملے۔ یہ فیصلہ آج تک قائم ہے۔

بہر کیف بیت بازی میں دوسروں کے اچھے اچھے شعر سناتے سناتے اور کبھی

کبھار اپنے اچھے برے شعر کہتے کہتے ہم نے اسکول سے کالج اور کالج سے یونیورسٹی میں داخلے تک کا سفر طے کر ہی لیا۔ لکھنؤ یونیورسٹی اور اس کا اردو ڈپارٹمنٹ ہمارے لیے ایک نئی دنیا ثابت ہوا۔ ایک طرف اگر ہمیں پروفیسر نورالحسن ہاشمی (عجیب بات یہ پتہ چلی کہ موصوف رشتہ کے اعتبار سے ہماری ایک عمر میں ہم سے بڑی بھانجی کے شوہر اور اس طرح ہمارے بھنیج داماد ہیں، رشتہ کی اس عظمت سے ہم ایک عمر سرشار رہے) ڈاکٹر احتشام حسین، ڈاکٹر خلیل خاں اور پروفیسر شبیہہ الحسن نونہروی جیسے باکمال عالموں کی آنکھیں دیکھنا نصیب ہوئیں، تو دوسری طرف ہریش سکسینہ جیسے لوگوں سے ملاقات ہوئی جو اردو ادب میں کسی مضمون پر پی، ایچ، ڈی کر رہے تھے اور نہ جانے کب سے کر رہے تھے۔ جونیر ہونے کے ناتے نہ صرف ہمیں اُنکی جھڑکیاں سننا پڑتی تھیں بلکہ انکے حکم پر یونیورسٹی سے دو میل دور نشاط گنج میں گومتی کے کنارے واقع پیپر مل کے پاس سے کشمیری سہاگہ (چرس) کے پودے بھی اُکھاڑ کر لانا پڑتے تھے۔ کشمیری سہاگہ اور عام چرس کے پودوں کا فرق وہ ہمیں اس تفصیل سے بتایا کرتے تھے کہ اگر بعد میں بھی وہ باتیں یاد رہتیں تو ہم اس ملک میں منشیات کا خفیہ کاروبار کر کے کروڑوں میں کھیل رہے ہوتے۔ خود وہ آج کل ناروے میں نارو تجین مردوں، عورتوں کو یوگا کے علاوہ پاؤں کی دو انگلیوں میں برش پکڑ کر پینٹنگ کرنا سکھاتے ہیں اور سنا ہے کروڑوں میں کھیل رہے ہیں۔ بڑی خوفناک قسم کی شاعری کیا کرتے تھے،

''اوغم گسارو، رنگے سیارو، مجھے نہ حق گوئی پر اتارو
وگرنہ یارو، یہ یاد رکھو، تمھاری چمڑی ادھیڑ دونگا''

خدا کا شکر ہے کہ ہم انکی شاعری سے بہت زیادہ متاثر نہیں ہوئے، کیونکہ ہم نے تو پروفیسر احتشام حسین کے ہاتھوں پر بیعت رکھی تھی۔ یہ بیعت بھی بلا جواز نہیں تھی۔ ہوا یوں کہ ایک بار اردو ڈپارٹمنٹ کی بزم اردو نے طالب علموں کا ایک مشاعرہ رکھا۔ یہ بھی کم بخت طرحی مشاعرہ تھا اور مصرعۂ طرح غالب کا معروف مصرع ''کہتے ہیں نہ دیں گے ہم، دل اگر پڑا پایا'' تھا۔ ہم نے بھی طبع آزمائی کی اور ہماری غزل سپر ہٹ ثابت ہوئی۔ اس کے ایک شعر

سیکڑوں کی جاں چھوٹی تیری تیغ تو ٹوٹی
ہم کو سر کا غم ہی کیا، ہم نے خوں بہا پایا

سن کر احتشام حسین صاحب نے ہمیں باقاعدہ شاعر ہو جانے کی بشارت سنا دی۔ چنانچہ ہم لکھنؤ یونیورسٹی کے گنے چنے شاعروں میں شمار ہونے لگے۔ اگر اس کے بعد بھی ہم احتشام صاحب کے ہاتھوں پر بیعت نہ کرتے تو اردو شاعری کے خیمۂ شمر میں نظر آتے۔

یہیں ہماری ملاقات کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا سے ہوئی۔ یہ بات ۱۹۵۷ء کی ہے۔ سنا ہے اُس وقت ساری دنیا میں کمیونزم زوال پذیر تھا۔ ہوگا، ہماری یونیورسٹی میں تو پورے عروج پر تھا۔ صرف کامریڈ بمل مترا، کامریڈ کالی شنکر شکلا، کامریڈ بابو، ابن حسن، انل گپتا، عبدالمنان ثانی اور حیدر عباس ہی نہیں، اردو ڈپارٹمنٹ کے تمام شاعر اور ادیب بھی کسی نہ کسی حد تک اشتراکی یا کم از کم ترقی پسند ضرور تھے۔ احتشام حسین کی بلند و بالا شخصیت کی موجودگی کسی کو اس ڈگر سے ہٹنے کی اجازت ہی نہیں دیتی تھی۔ ہم بھی کمیونسٹ ہو گئے۔ ممبر تو نہیں بنے، لیکن انقلاب کی حمایت اور بورژوائی ذہنیت کی

مذمت میں وہ جوش اور شدت دکھاتے تھے کہ پارٹی کے ممبر بھی ہماری کمیونزم کے آگے پانی بھرتے دکھائی دیتے تھے۔ بالکل اُن لوگوں کی طرح جو روزہ نماز تو نہیں کرتے لیکن جہاد کی حمایت اور روشن خیالی کی مذمت اس جوش سے کرتے ہیں کہ اُن پر سچے اور پکے مسلمان ہونے کا گمان ہونے لگتا ہے۔

یونیورسٹی پہونچ کر یہ خیال آیا کہ شاعری کے لیے عشق کرنا بہت ضروری ہے۔ چنانچہ معاشقوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوا۔ کچھ معاشقے تو محض اس لیے ناکام ہوئے کہ دوسری طرف سے کوئی جواب ہی نہیں ملا۔ جواب کیا خاک ملتا، جب سوال ہی کرنے کی ہمت نہیں پڑی۔ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں کہ لڑکیاں نگاہوں کی زبان سمجھ لیتی ہیں۔ ہماری نگاہوں کی زبان تو کوئی لڑکی نہیں سمجھی یا شاید جن لڑکیوں کی طرف ہم نے نگاہ شوق کی، وہ نظری لسانیات سے قطعی نابلد تھیں۔ بی، اے کا دوسرا سال تھا کہ ہماری ایک ہم جماعت، جس کے اور ہمارے درمیان صرف یونیورسٹی کا ہسٹری ڈپارٹمنٹ ہی مشترک تھا۔ نظری لسانیات کی نہ صرف جانکار بلکہ ماہر ثابت ہوئی۔ اس نے صرف ہماری نگاہ شوق بلکہ ہمارے سلام شوق کا بھی جواب دیا اور ہم جو عشق کے لیے نہ جانے کب سے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے، اُس حسینہ پر چاروں ہاتھ پاؤں سے عاشق ہو گئے۔ پہلے صرف شاعری کی تیغ پر دھار رکھنے کے لیے، پھر تمام سنجیدگی اور وارفتگی کے ساتھ ہمارا عشق پنپنے لگا اور بات ساری یونیورسٹی سے نکل کر کامریڈوں کی محفل تک پہونچ گئی۔ ہمیں تنبیہہ کی گئی کہ اشتراکیت اور عشق ایک ساتھ نہیں رہ سکتے، لیکن اس بار ہمارا عشق کمیونزم پر بھاری پڑا۔ اس عشق کا انجام بتانے سے پہلے ایک اور واقعہ سنانے کی

اجازت دیجئے جس نے ایک بار پھر ہماری شاعرانہ حیثیت کے مسلم ہونے میں زبردست کردار انجام دیا تھا۔

یونیورسٹی میں ایک کلچرل پروگرام تھا۔ جس میں ہماری ایک دوست آشا کو، جو بے حد خوش آواز تھیں گانا گانا تھا۔ پروگرام کافی بڑا تھا۔ آشا نے اپنے لیے جو گانا چنا تھا وہ ایک مشہور فلم نو بہار میں روشن کا کمپوز کیا ہوا اور اتھیا کا لکھا ہوا گانا ''اے ری میں تو پریم دوانی میرا درد نہ جانے کوئی'' تھا۔ اب معاملہ یہاں اٹکا کہ آشا کو اس کا ایک انترہ تو یاد تھا، جو یوں تھا،

''نہ میں جانوں آرتی بندھن، نہ پوجا کی ریت،
میں انجانی درس دوانی، گھائل میری پریت،
ری ایلی میں نے دو نینوں کے دیپک لیے سنجوئے،
اے ری میں تو پریم دوانی میرا درد نہ جانے کوئی''

لیکن دوسرا انترہ یاد نہیں تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں دوسرا انترہ کہیں سے بھی ڈھونڈ کر لاؤں۔ ہم نے فلمی گانوں کی شہر کی ساری فٹ پاتھی دوکانیں چھان ماریں، لیکن فلم نو بہار کے گانوں کی کتاب نہ ملنا تھی، نہ ملی۔ حد یہ کہ ہز ماسٹرس وائس گراموفون کی دوکان میں گانے کا ریکارڈ بھی نہیں ملا۔ پروگرام کی تاریخ سر پر آ گئی۔ آشا کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ اب آپ جانئے کسی خوبصورت لڑکی کے آنسو ہم آج نہیں دیکھ پاتے تو اس وقت ہمارا کیا حال ہوا ہوگا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کے آنسو اپنی آنکھوں میں کیسے رکھ لیں۔ یہاں یہ بات یاد دلاتے چلیں کہ آشا بہت خوبصورت تھی لیکن ہماری اس

سے صرف دوستی تھی، عشق نہیں تھا۔ دراصل ہمارا دل تو چاہتا تھا کہ اس سے باضابطہ عشق کریں، لیکن ہمارا عشق شمسہ سے چل رہا تھا اور اس وقت ہمیں ایک وقت میں دو دو عشق کرنے اور ایک عشق کو دوسرے سے چھپانے کا گر نہیں آتا تھا، یہ مہارت ہمیں بہت بعد میں حاصل ہوئی۔ بہر حال جب اس نے کہا کہ تم بڑے شاعر بنے پھرتے ہو، کیا میری خاطر چار لائنیں بھی نہیں لکھ سکتے، کس کام کی تمھاری شاعری؟ تو طعنہ جگر کے پار ہو گیا اور ہم نے کہا کہ تمھارے آنسوؤں کی قسم اگر دوسرا انترہ نہ لکھ پائے تو شاعری کرنا چھوڑ دیں گے، جیب میں چار آنے اور چار مینار کی ایک ڈبیہ ڈال کر سیدھے کافی ہاؤس پہونچے اور بقول ظ، انصاری مرحوم کاغذ پر دیدے ٹپکانے لگے۔ آخر شام تک دوسرا انترہ لکھ ہی ڈالا۔ آشا کی یہ بھی شرط تھی کہ دوسرا انترہ پہلے سے انیس نہ ہونا چاہیے۔ شام کو انترہ آشا کو اس کے گھر جا کر سپرد کیا، جو ایک بزرگ کمیونسٹ لیڈر کی صاحب زادی بھی تھی۔ دو دن بعد وہ گانا آشا نے پروگرام میں سنایا۔ دھوم مچ گئی۔ ہماری نہیں آشا کی آواز کی، کیونکہ یہ بات تو چند ہی لوگوں کو معلوم تھی کہ دوسرا انترہ ہمارے زور قلم کا نتیجہ تھا۔ بعد میں ہمیں ایک ایک کو روک کر بتانا پڑا تھا کہ جس گانے پر کل تم لوگ جھوم اٹھے تھے، اس کا دوسرا انترہ ہم نے لکھا تھا۔ کچھ لوگوں کو تو باقاعدہ آشا کو گواہ بنا کر قائل کرنا پڑا۔ چونکہ آپ جیسے بہت سے لوگوں کو ہماری جودت طبع کا حال نہیں معلوم، اس لیے وہ انترہ لکھ ہی دیتے ہیں، آپ بھی کیا یاد کریں گے۔ وہ کچھ یوں تھا،

پریم کی نیا، من کا مانجھی اور تن کی پتوار
پیر کا ساگر، درد کی لہریں، ساجن ہیں اُس پر

ری ایلی میں تو چل نکلی اب ہونا ہے سو ہوئے
اے ری میں تو پریم دوانی میرا درد نہ جانے کوئی

عشق کی بات تو رہ ہی گئی۔ ہمارا تعلق ایک ایسے گھرانے سے تھا جو آمدنی کے اعتبار سے اُس وقت کے ٹھیٹھ متوسط طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ ہماری پہلی محبت یعنی محبوبہ کا تعلق ایک کافی خوشحال اور روشن خیال مسلم گھرانے سے تھا۔ خوشحالی کا ثبوت یہ تھا کہ وہ اور اس کی بڑی بہن دونوں کو انکے والد کی کار یونیورسٹی چھوڑنے اور واپس لے جانے آیا کرتی تھی اور روشن کا خیالی کا ثبوت یہ تھا کہ خورشید کو بھارت ناٹیم سیکھنے کی اجازت دے دی گئی تھی اور یہ تب ہوا تھا، جب یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ لڑکیاں شادی کے بعد اپنے شوہروں کو تگنی کا ناچ نچانے کے علاوہ کچھ اور سیکھ سکتی ہیں۔ انہیں نچانے کی آزادی حاصل تھی، ناچنے کی نہیں اور وہ بھی بھارت ناٹیم۔ استغفر اللہ۔ بہر حال اس کے بھارت ناٹیم سیکھنے پر نہ اس کے والد کو کوئی اعتراض تھا، نہ ہم کو۔ بس اسی مقام پر ہم اور خورشید کے والد ہم خیال تھے، باقی کسی موضوع پر ہم خیال ہونے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ بہر حال ہمارا عشق دھوم دھام سے چلتا رہا اور ہماری غربت اور لڑکی کی خوش حالی کے سبب ہمارے دوستوں کے لیے رشک وحسد کا باعث بنتا رہا۔ ہم دونوں کا ایک دوسرے کے گھر آنا جانا بھی شروع ہو گیا، جو اس بات کو ثبوت تھا کہ طرفین کے اہل خانہ کو اس عشق پر کوئی خاص اعتراض نہیں تھا۔ اس دوران لڑکی کی بڑی بہن کی، جو نہ صرف بہت خوش جمال بلکہ دراز قد یعنی شاعری کی زبان میں سرو قد اور شمشاد قد بھی تھی، شادی یورپ میں ملازم ایک لڑکے سے طے ہو گئی۔ شادی کے انتظامات میں ہم بھی صدق دل سے شریک تھے کہ اس

بہانے ہمیں اپنی محبوبہ سے قربت نصیب ہوئی تھی۔ ہم خوش بھی تھے کہ اب ہماری اپنی محبوبہ سے شادی کی دوری ختم ہو رہی تھی۔ مگر ایک عجیب روح فرسا واقعہ ہوا۔

شادی کے انتظامات عروج پر تھے کہ صرف دو دن پہلے شمسہ رات گئے ہمارے گھر پر آئی۔ اس سے پہلے کہ ہم اُس سے بے وقت آنے کا سبب پوچھ پاتے، اُس نے نمناک آنکھوں اور بڑی غمناک آواز میں پوچھا ''کمال آپا تمھارے یہاں تو نہیں آئیں''؟ ''آپا'' کبھی ہمارے گھر نہیں آئی تھیں۔ ہمارے کان کھڑے ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ دوپہر سے ''آپا'' کا کہیں پتہ نہ تھا، سارے دوستوں اور عزیز داروں کے گھر چھان مارے جا چکے تھے، مگر ہر جگہ مایوسی ہی ہاتھ آئی تھی۔ بڑی بہن کی تلاش میں سب کے ساتھ ہم بھی شامل ہو گئے۔ کھانا پینا بھول کر اپنی سیکنڈ ہینڈ سائکل پر سارا شہر چھان مارا۔ اس تلاش میں شادی کا دن آ گیا۔ دعوت نامے تقسیم ہو چکے تھے اور ایک معزز گھرانے کی عزت داؤں پر لگی ہوئی تھی۔ بس اتنا پتہ لگ سکا تھا کہ وہ سروقد، شمشاد قد بڑی بہن کو توال شہر کے لڑکے کے ساتھ فرار ہو چکی ہے، جو نہ صرف پستہ قد تھا بلکہ ہندو بھی تھا۔ غرض کہ اسلام پوری طرح خطرے میں تھا۔ آخر یہ پتہ ہم ہی نے لگایا کہ دونوں کو ہردوئی کے اسٹیشن پر دیکھا گیا ہے۔ لڑکے کے والد اور کوتوال شہر اپنے لڑکے کی نالائقی پر بالکل پولس والوں کے انداز میں بے حد برہم تھے۔ ہم خوشی خوشی یہ مژدۂ جانفزا سنانے اس کے گھر کی طرف روانہ ہوئے، آدھے ہی راستے میں تھے کہ ہمارے ایک خالہ زاد بھائی نے ہمیں یہ روح فرسا خبر دی کہ شمسہ کا نکاح ہو گیا۔ خبر ہمارے اوپر بجلی کی طرح گری اور ہم بجلی کی طرح سائکل سے زمین پر گر گئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ جس

سے نکاح ہوا وہ وہی تھا جس سے بڑی بہن کی شادی ہونے والی تھی۔ کم بخت صرف رقیب ہی نہیں ستم ظریف بھی نکلا۔ ہوا یوں کہ وہ شادی کے دن بارات لے کر گھر آ گیا اور جب احوال اپنی ہونے والی دولھن کے فرار ہو جانے کا سنا تو پسر کر بیٹھ گیا کہ خالی ہاتھ جائے گا تو اپنے سفید فام دوستوں کو اپنا سیاہ فام چہرہ کیسے دکھائے گا، چنانچہ اب تو چاہے گھر کی خادمہ سے شادی کرنا پڑے مگر شادی اسی گھر میں کرے گا۔ اس ڈرامائی صورت حال میں ماں باپ کی آنکھوں سے جوئے اشک بہتے دیکھ کر چھوٹی بہن نے روایتی فرمانبرداری اور اطاعت شعاری کا ثبوت دیتے ہوئے، جو مشرقی دوشیزاؤں کا طرۂ امتیاز بھی ہے اور مجبوری بھی، اپنی خدمات پیش کر دیں۔ چنانچہ جب ہم باحال پریشاں جائے واقعہ پر پہونچے تو شادی کے نقارے بج چکے تھے، بلکہ بج رہے تھے۔ اس واقعہ نے ہمیں وہ شہرت دی جو اب تک نہ شاعری نے دی تھی نہ خود عشق نے۔ ہم بالکل دیوداس کے دلیپ کمار بن گئے۔ کئی روز تک داڑھی بھی نہیں بنائی۔ دوستوں نے بڑی مشکل سے ہمیں یقین دلایا کہ ہم نہ دلیپ کمار ہیں نہ دیوداس۔ دلیپ کمار اس لیے نہیں کہ ہم انکی طرح وجیہ و شکیل نہیں ہیں اور دیوداس اس لیے نہیں کہ دیوداس کی پارو کی شادی ایک بوڑھے کھوسٹ سے ہوئی تھی، جب کہ ہماری محبوبہ کی شادی ایک ہم سے زیادہ خوش شکل اور صاحب حیثیت نوجوان سے ہوئی تھی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس ناکامی نے ہمیں کچھ اور کمیونسٹ بنا دیا۔ ہمیں پہلی بار اپنی غربت اور اپنے رقیب کی دولت مندی سے سرمایہ دارانہ نظام کے جبر کا احساس ہوا۔ ہماری پہلی نظم ''گلیوں کا شہزادہ'' اسی وقت کی یادگار ہے۔ یہ نظم ازراہ کرم مرحوم اعجاز صدیقی نے ''شاعر'' میں چھاپی تھی۔ نظم کی

اشاعت نے عشق کی ناکامی کا غم ہلکا کر دیا۔ یہ حال تھا کہ شارہ کے شہر میں آنے کے بعد جو ہماری طرف دیکھتا تھا کہ ہمیں لگتا تھا کہ وہ یقیناً ہمیں اس لیے دیکھ رہا ہے کہ اس نے شاعر میں ہماری نظم پڑھ لی ہے۔ لیکن اس ناکامی کا ایک عجب اثر یہ ہوا کہ جو صنف نازک ہمیں اب تک صرف حسین اور معصوم نظر آتی تھی، وہ اب مظلوم بھی نظر آنے لگی۔ صنف نازک سے ہماری دلچسپی ہمدردی میں بدل گئی۔ کچھ اپنا غم ہلکا کرنے کے لیے اور کچھ روایتوں سے بغاوت کے جذبے کے تحت ہم نے اپنے خاندان میں تعلیم نسواں کی مہم چلا دی۔ کچھ بزرگ خاندان والوں نے مخالفت بھی کی۔ ایک آدھ گھروں کی لڑکیوں کا ہم سے پردہ بھی کرا دیا گیا، لیکن عام طور پر ہماری اس مہم کا استقبال ہی کیا گیا۔ لڑکیوں نے خاص طور پر ہمارا ساتھ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں کئی لڑکیاں جن کی زندگی باورچی خانے اور اور سلائی کڑھائی تک محدود تھی، پردہ میں رہ کر بھی ادیب ماہر اور ادیب کامل ہو گئیں اور ہم انکے ہیرو قرار پائے۔ تب تک ہم یونیورسٹی کی اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جوائنٹ سکریٹری بھی ہو چکے تھے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب ہم نے سنجیدگی سے اردو ادب اور کسی حد تک انگریزی ادب اور پھر جنون کی حد تک مذاہب کا مقابلہ جاتی مطالعہ شروع کیا۔ وید، پران، اپنشد، جاتک کتھائیں، رامائن، گیتا، انجیل مقدس غرض کہ جو کچھ ہاتھ لگا، چاٹ ڈالا۔ چونکہ سنسکرت ہمارا نصابی مضمون بھی تھا، اس لیے خصوصاً ہندو اساطیری داستانیں ہمیں مانوس سی لگتی تھیں۔

شعر و شاعری، طلباء پھر شہر، پھر ملک اور پھر ساری دنیا کی سیاست پر لمبی بحثوں، معاشقوں، کریکٹ، تیراکی، ادب کی سنجیدہ پڑھائی، مذاہب کا مقابلہ جاتی

شریکِ زندگی کلووَر

کے نام

جس نے زبان نہ جانتے ہوئے بھی

میری شاعری کی حفاظت کی

مطالعہ اور بے حساب فلم بینی میں بے پناہ مصروف رہنے کے بعد بھی ہم بی، اے ہو گئے۔ ہمارے خاندان والوں کو ہمیشہ یہ حیرانی رہی کہ ہم نے سیکنڈ ڈیویژن کیسے حاصل کر لیا۔ اب مصیبت یہ تھی کہ والد صاحب چاہتے تھے کہ ہم قانون کی ڈگری حاصل کریں اور خود ہمارا دل قدیم ہندوستانی تاریخ اور آثار قدیمہ (آرکیولوجی) میں اٹکا ہوا تھا۔ والد صاحب کی جیت ہوئی اور ہم نے ایل، ایل، بی میں داخلہ لے لیا۔ لیکن ایک سال پورا کرنے کے بعد دل اچاٹ ہو گیا اور گھر والوں کو بتائے بغیر ہم آرکیولوجی میں ایم، اے کے پہلے سال میں کود پڑے۔ اب معاشی صورت حال سنگین ہو چکی تھی۔ والد صاحب یونیورسٹی کی فیس دینے کی حد تک تو والی اور کفیل تھے، لیکن ہماری غیر تعلیمی اور غیر شرعی سرگرمیوں کے لیے والد کی آمدنی بقدر ذوق نہیں تھی، کچھ اور وسعت چاہتی تھی۔ اپنے خرچ کے لیے ہم انگریزی، ہندی اور اردو اخبارات کے لیے جز وقتی کام کر لیا کرتے تھے، وہ بھی ناکافی ثابت ہوتے تھے۔ اس لیے فیصلہ کیا کہ نوکری کرنی چاہیے۔ اتر پردیش گورنمنٹ روڈ ویز کے جونیر اسٹیشن افسر کے لیے ۳۶ اسامیوں کی تلاش کا اشتہار نکلا، جس کا پہلا مرحلہ ایک تحریری امتحان تھا۔ ہم نے بالکل لگے ہاتھوں اسٹائل میں فارم بھر دیا۔ معلوم ہوا کہ ہمارے جیسے ۸ ہزار منچلوں نے بھی ہماری تقلید کی ہے۔ بالکل اطمینان ہو گیا کہ کہ نوکری ملنے کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ لیکن اس کو کیا کہیے کہ ممتحن نہایت کم علم تھے کہ انہوں نے ۸ ہزار امیدواروں میں ہمیں سب سے بہتر قرار دیا۔ اب مرحلہ انٹرویو کا تھا، لیکن اس کی ہمیں چنداں فکر نہیں تھی کیونکہ ''شاعر انقلاب ثانی''، یعنی حسن شہیر صاحب کے بڑے بھائی یو، پی سرکار کے وزیر ٹرانسپورٹ تھے۔ چنانچہ انٹرویو لینے والے ہمارے

جوابوں اور وزیر ٹرانسپورٹ کے سکریٹری کے فون سے اتنا متاثر ہوئے کہ ہم یو، پی گورنمنٹ روڈ ویز کے جونیر اسٹیشن افسر ہو گئے۔ والد صاحب کو قطعی یقین نہیں آیا، انہیں یقین آیا اس دن جب گھر پر یہ سرکاری پروانہ آیا کہ ہمیں پندرہ روزہ ٹریننگ کے لیے کانپور روانہ ہونا ہے۔ سردی کے دن تھے، ہمارے والد صاحب جو سردی میں بھی ٹھنڈے پانی سے نہانے کے عادی تھے، اس دن کچھ زیادہ ہی سویرے رات کے رکھے پانی سے نہا لیے۔ والدہ کے استفسار پر اس جلدی کا یہ جواب دیا کہ وہ پہلے ہماری ہمشیرہ کی سسرال ان سے ملنے اور انہیں خبر دینے اور پھر ہمارے لیے سامان سفر خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ نہا کر فارغ ہی ہوئے تھے کہ فالج کا حملہ ہوا، تین ہی دنوں میں انہوں نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور زندگی میں پہلی بار ہمیں دنیا اندھیر ہو جانے کے محاورے کا مطلب سمجھ میں آیا۔ ہم نے اپنے والد کو اپنی زندگی کا کچھ اس طور پر جزو لاینفک مان لیا تھا کہ کبھی انکے بغیر اپنی زندگی کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ ہم نے اپنی زندگی کا ایک ہی مقصد بنایا تھا کہ برسر روزگار ہوتے ہی سب سے پہلے اپنے والد کے دمہ کے مرض کا علاج کروائیں گے۔ حضرت علی کا قول برحق ہے کہ ''میں نے خدا کو اپنے ارادوں کی ناکامی سے پہچانا''۔

بہرحال ''وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں''۔ اب ہم پوری طرح سرکاری نوکر تھے، کیونکہ نوکری اب ضرورت ہی نہیں مجبوری بن چکی تھی۔ چار سال تک روڈ ویز کی خاک چھانتے اور پھانکتے رہے۔ مزاج کو زندگی کا یہ حادثہ قطعی ناگوار تھا۔ لکھنؤ سے دور جی لگنا محال تھا۔ چونکہ یو، پی روڈ ویز کی بسیں جہاں جہاں جاتی تھیں، ہم

سفر کر سکتے تھے۔ نہ کوئی یہ پوچھ سکتا تھا کہ ٹکٹ ہے یا نہیں، نہ یہ کہ کیوں اور کہاں جا رہے ہیں۔ چنانچہ ذرا موقع ملا اور لکھنؤ آدھمکے کافی ہاؤس آباد کیا، دل شاد کیا اور چل نکلے۔ اتفاق سے ہماری پوسٹنگ ہمارے سسرال فتح پور ضلع بارہ بنکی میں ہوگئی۔ یہاں ہمیں اپنے خاندان کی ایک لڑکی ایسی بھائی کہ دنیا و مافیہا بھول گئے۔ نوکری میں بھی مزا آنے لگا۔ اس بار ہمارے اپنے ہی خاندان والے ظالم سماج بن کر بیچ میں آ گئے۔ ہم کمبھ میلے کے سلسلہ میں الہ آباد میں میلہ افسر مقرر ہوئے۔ پندرہ دن تک ہم ساری دنیا سے کنارہ کش رہے، کیونکہ ہمارے اور باقی دنیا کے مابین نہ صرف کمبھ یاتری بلکہ نہایت خوفناک قسم کے ناگا سادھو حائل رہے۔ اسی پندرہ دن کے عرصے میں ہمارے ظالم سماج نے ہماری محبت کا تختہ الٹ دیا اور جب ہم لوٹ کر آئے تو "دیکھا تو وہ گل ہوا ہوا تھا، کچھ اور ہی گل کھلا ہوا تھا"۔ اس بار تو دل دنیا کی ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا۔ حد یہ ہے کہ شہر لکھنؤ بھی زہر لگنے لگا۔ اور ہم نے لکھنؤ چھوڑنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔

شہر بمبئی میں آمد اور اردو بلٹز کی ملازمت بھی ایک دلچسپ حادثہ کا ہی نتیجہ تھا۔ ہمارے دوستوں کے حلقے میں کامریڈ نجم الحسن بھی شامل تھے، جن کی نہایت خوبصورت سنہری داڑھی کے سبب لوگ انہیں مولانا کہتے تھے۔ نہایت قابل انسان۔ انگریزی زبان پر کمال کا عبور حاصل تھا، انگریزی کے اچھے صحافیوں میں شمار ہوتے تھے۔ ٹریجڈی یہ تھی کہ انہیں بڑے بڑے انگریزی اخبارات سے آفر تھے، لیکن یہ سارے اخبارات لکھنؤ سے باہر تھے اور وہ لکھنؤ سے باہر جانے کو تیار نہیں تھے۔ فاقہ کشی کی نوبت آ گئی، لیکن وہ وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ اسی دوران انہیں دی ٹائمس آف انڈیا سے سینیئر رپورٹر کے

عہدے کی پیش کش ہوئی۔ وہ انکار کر دیتے۔ لیکن دوستوں نے ایک ہنگامی اجلاس طلب کیا، جس کے محرک احمد جمال پاشا مرحوم تھے۔ یہ طے ہوا کہ مولانا کو اس بار دلّی جانا ہی ہوگا اور اگر انہوں نے آنا کانی کی تو ان سے ملازمت بالجبر کا سلوک کیا جائے۔ یہ کام ہمارے سپرد ہوا کہ ہم انہیں دلّی لے جائیں۔ مولانا ہمیں چاہتے تو بہت تھے، لیکن انہیں یقین تھا کہ "اس لونڈے کی کیا مجال کہ ہمیں ہماری جگہ سے ہلا سکے"۔ ہم نے پہلے تو انکی منت سماجت کی، داڑھی کو ہاتھ لگایا، جب وہ نہ مانے تو تیور بدل دئے۔ ہم نے انہیں جتا دیا کہ اب انکار کا نتیجہ نہایت خوفناک صورت میں ظاہر ہو سکتا ہے۔ مولانا جانتے تھے کہ ہمارے نزدیک ترین دوستوں میں وہ لڑکے بھی شامل ہیں، جنہیں ہم اسٹوڈنٹ لیڈر اور باقی شہر دادا کہتا تھا۔ ہم نے مولانا کو ان میں سے دو چار کے نام بھی بتائے۔ مولانا شاید اپنی زندگی میں پہلی بار خوفزدہ دکھائی دئے اور شاید پہلی ہی بار انہوں نے ہمیں بہت سنجیدگی سے لیا ورنہ تو چٹکیوں میں اڑا دیتے تھے۔

تمام دوستوں کی معیت میں انہیں چار باغ کے بس اسٹیشن لایا گیا کہ یو، پی روڈویز کی ایک بس دلّی بھی جاتی تھی اور ہم اس پر شان سے نہ صرف خود بے ٹکٹ سفر کر سکتے تھے، بلکہ اپنی افسری کے طفیل دوسروں کو بھی کرا سکتے تھے۔ دوستوں نے مولانا کا سارا زادِ سفر جو دو سو روپئے پر مشتمل تھا، انکی جیب سے نکال کر ہمارے حوالے کیا کہ مبادا مولانا کہیں بیچ میں اتر کر راہ فرار نہ اختیار کر جائیں۔ ہم انہیں دلّی لائے تاکید کے مطابق انہیں ان ہی کے ایک دوست سردار نریندر سنگھ کے گھر پر لے گئے، جو لنڈن اکونومسٹ کے نامہ نگار تھے۔ اگلے دن انہیں ٹائمس آف انڈیا کے دفتر جا کر نوکری جوائن کروائی

اور خود واپس لوٹ آئے۔ مولانا کو نوکری راس آئی۔ ہم نے دعا کی جیسے انکے دن پھرے اللہ سب کے دن پھیرے۔ یہ دعا بھی قبول ہوگئی۔ مولانا کو علم تھا کہ ہم روڈویز کی افسری سے بے زار ہیں۔ اتفاق سے انہیں انکے دوست انور عظیم صاحب نے، جو مدیر اردو بلٹز تھے، بمبئی بلانا چاہا۔ مولانا نے ان سے کہا کہ وہ تو نہیں آسکتے، لیکن اگر وہ دوستی نبھانا ہی چاہتے ہیں تو ہمیں (خادم کو) بلا لیں۔ انور عظیم صاحب ان شریف اور بلند اخلاق انسانوں میں سے تھے، جو نہ صرف دوستوں، بلکہ دوستوں کے دوستوں کی بھی مدد کو تیار رہتے تھے۔ ہماری ان سے کوئی جان پہچان نہیں تھی۔ صرف یہ جانتے تھے کہ بڑے افسانہ نگار ہیں۔ پاکستانی رسالوں میں انکے کچھ افسانے پڑھ بھی رکھے تھے۔ انہوں نے ہمیں انگریزی کی ایک رپورٹ بھیجی کہ ہم اس کا اردو ترجمہ کر کے انہیں بھیجیں۔ ہم نے جی جان سے ترجمہ کیا اور کوئی پندرہ دن بعد ہمارے پاس اردو بلٹز کی سب ایڈیٹری کا پروانۂ تقرری آ گیا۔ ہم سب چھوڑ چھاڑ کر بمبئی کی طرف بھاگے۔ بمبئی شہر میں ہم کسی کو نہیں جانتے تھے اور معلوم ہوا کہ اپنی شاعرانہ عظمتوں کے باوجود کوئی ہمیں بھی نہیں جانتا تھا۔ بس لے دے کے ایک وقار پاشا تھے، جو ہم جماعت بھی رہ چکے تھے اور ہماری ہی طرح بلکہ ہمارے ساتھ ہی ایک عشق میں ناکام بھی ہو چکے تھے۔ ان کو یک خط لکھا کہ وہ ہمیں آکر دادر اسٹیشن سے لے جائیں۔ ۱۴ر جون ۱۹۶۵ء کو ہمارا یک نفری قافلہ دادر اسٹیشن پر وارد ہوا۔ چھاجوں پانی برس رہا تھا۔ ہم نے اپنی زندگی میں ایسی مہیب اور ہولناک برسات نہیں دیکھی تھی۔ اسٹیشن پر برسات کے سبب خاصا اندھیرا تھا وقار پاشا کو کہیں دور دور تک نہ دیکھ کر ہماری آنکھوں میں بھی اندھیرا چھا گیا۔

لیکن تھوڑی ہی دیر میں یار باوفا بھاگتا ہوا آیا اور ہم فرط مسرت بلکہ فرط احساس تحفظ سے چور ہو کر اس سے لپٹ گئے۔ وہ باندرہ ریلوے کالونی میں واقع اپنے گھر لے گیا، وقار کی خوبصورت اور خوب سیرت بیوی شاکرہ بڑی محبت سے پیش آئی؛ اگلا دن برسات نے رنگ دکھایا اور ہمیں ٹوٹ کر بخار آیا۔ بہر حال ۱۶ر جون ۱۹۶۵ء کو ہم نے بلٹز جوائن کر لیا۔ انور عظیم ہماری توقع سے زیادہ مہربان نکلے۔ کچھ دن بعد اپنی اہلیہ کے دلّی چلے جانے پر انہوں نے ہمیں اپنے گھر بلا لیا۔ وہ ہماری داستان غم سے واقف ہو چکے تھے اور ایک ناکام و نامراد عاشق کی جس جس طرح بھی دلجوئی کی جا سکتی ہے، کرتے رہے۔

اب تک ۲۱ ناکام عشق ہمارے کھاتے میں درج ہو چکے تھے۔ مگر چوٹ پر چوٹ کھانے کے بعد بھی جذبہ عشق پوری طرح سلامت تھا۔ خود انور عظیم صاحب نے بھی جواب ہمارے انور بھائی بن چکے تھے۔ دو ایک جگہ ہمارا عشق کرانا چاہا، لیکن بات بنی نہیں۔ بوجوہ انور بھائی کو نوکری چھوڑنی پڑی اور ہم ایک بار پھر یتیم ہو گئے۔ لیکن اس کو کیا کہئے کہ اللہ شکر خورے کو شکر دیتا ہی ہے۔ بلٹز میں ہماری ملاقات شعبہ اشتہارات کی مہتمم ایک منگلوری حسینہ کلوور سیکورا سے ہو گئی۔ اس بار جو عشق ہوا اس کا انجام بخیر و خوبی نکاح پر ہوا۔ وہ منگلوری حسینہ کلوور سیکورا سے کلوور کمال بن گئی اور اب تک بنی ہوئی ہے۔ شاید ہم اب بھی کوچۂ عشق میں ہاتھ پاؤں مارتے، لیکن یہ منگلوری حسینہ بلا کی طرار نکلی، اس نے تھوڑے ہی عرصہ ایک گوری چٹی، من موہنی، ہنستی کم اور روتی زیادہ بچی سمیرا ہماری گود میں ڈال دی۔ اس بچی نے آ کر نہ صرف ہمارے بے مہار جذبہ عشق، بلکہ تمام غیر شرعی علتوں پر ایسا بریک لگایا کہ گاڑی جہاں کھڑی ہوئی آج تک وہیں کھڑی ہے۔

اس بیچ ہم اردو بلٹز کے ایڈیٹر بنائے جا چکے تھے۔ باقی کی کہانی جس کا آغاز فلم نکاح کے نغموں سے ہوتا ہے، عام طور پر جانی جاتی ہے، دوہرانے سے فائدہ نہیں۔ زندگی بھر جو دیکھا، جو جھیلا وہ شاعری کی صورت میں آپ کے سامنے ہے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ یہ کیسی شاعری ہے، اچھی یا بری، کھری یا کھوٹی، لیکن یہ ضرور معلوم ہے کہ جھوٹی نہیں ہے۔ اس میں جو ہے آپ بیتی کے زمرے میں آتا ہے، جگ بیتی کے زمرے میں نہیں۔ اس شاعری میں کتنی اوریجنلیٹی ہے، ہمیں یہ بھی نہیں معلوم۔ ویسے اوریجنلٹی کے بارے میں ہم ہمیشہ مارک ٹوین کے قائل رہے، جس نے کہا تھا ''اس دنیا میں حضرت آدم وہ واحد انسان تھے، جو اس راز سے واقف تھے کہ وہ جو بات کہہ رہے ہیں، وہ ان سے پہلے کبھی نہیں کہی گئی اور کسی نے نہیں کہی''۔ حقیت یہ ہے کہ اوریجنل صرف ایک حرف کُن تھا، اس کے بعد جو بھی ہوا اسی کی پرچھائیں تھا۔ اوریجنلیٹی دراصل وہ سرقہ ہے جو پکڑا نہیں جا سکا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ کوئی تخلیق پڑھیں یا سنیں، وہ آپ کو اچھی لگے، اتنی اچھی کہ منہ سے بے ساختہ واہ نکل جائے، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ تخلیق آپ کی یادداشت سے محو ہو جائے۔ وہ کہیں نہ کہیں رہے گی، اگر شعور میں نہیں تو لاشعور میں۔ اور اگر وہ شعور یا لاشعور میں رہ گئی ہے تو یہ ناممکن ہے کہ اس کی پرچھائیں خود آپ کی کسی تخلیق پر نہ پڑے۔ اسد اللہ کو طرز بیدلؔ میں ریختہ کہنا اس لیے قیامت لگا تھا کہ انہوں نے طرز بیدلؔ میں ریختہ کہنے کی شعوری کوشش کی تھی۔ ذوقؔ کو میرؔ کا انداز نصیب نہیں ہوا، لیکن انہوں زور بہت مارا۔ خود میرؔ نے جب کہا

سراپا پہ جس جا نظر کیجئے　　وہیں عمر ساری بسر کیجئے

تو ان کے ذہن خانوں میں ان سے صدیوں سال پہلے کہا جانے والا یہ شعر ضرور رہا ہوگا،

ز فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

اس مجموعہ میں ایک غزل شامل ہے، جس میں یہ شعر بھی ہے،

لوگ تو بجھتے چراغوں کے دھویں سے خوش تھے،
ہم ہی بے کار جلائے ہوئے جاں بیٹھے تھے

غزل لکھنے کے کئی دن بعد اچانک خیال آیا کہ یہ تو فیض کے اس شعر کا عکس ہے،

تھے بزم میں سب دودِ سر بزم سے شاداں
بے کار جلایا ہمیں روشن نظری نے

ہم اس توارد پر شرمندہ نہیں ہیں، کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ فیض جانتے ہونگے کہ حافظ کہہ چکے تھے "اے روشنی طبع تو بر من بلا شدی"۔ جیسا کہ ہم نے شروع میں عرض کیا کہ جب ہم نے شعر گوئی کا آغاز کیا تو ترقی پسندی کا سورج ڈوب رہا تھا۔ بنّے بھائی مرحوم (سجاد ظہیر) اس کی احیا کی کوششوں میں لگے تھے، لیکن کوئی نتیجہ نہیں برآمد ہو رہا تھا، کیونکہ صرف ویت نام نہیں تھا، جہاں امریکی افواج نسل کشی کر رہی تھیں، چیکوسلواکیہ اور پولینڈ بھی ہو چکا تھا، جہاں روسی ٹینک دندنا رہے تھے، ترقی پسندی کی نیو ڈانواڈول ہو چکی تھی۔ کمیونزم مہاجنی کا مقابلہ تو کر سکتی تھی، لیکن اس کارپوریٹ سرمایہ داری کے سامنے بے بس ثابت ہو رہی تھی، جس میں مزدور خود بھی حصہ دار بنایا جا رہا تھا۔ دوسرے ترقی پسند شعرا میں سے جنہیں جو کچھ کہنا تھا، کہہ چکے تھے۔ سردار جعفری، مجروح، مخدوم،

ساحر سب یا تو خاموش ہو چکے تھے یا ترقی پسندی نے جو شہرت بخشی تھی، اس کے پھل بٹورنے میں مصروف تھے۔ جدیدیت کا سورج طلوع ہو رہا تھا، لیکن اس کی کرنوں میں نہ وہ نور تھا، نہ وہ تمازت جو دلوں کو اجال سکے یا گرما سکے۔ ہمارے وقت کے جدیدیے آج اپنی تخلیقات سمیت آخر شب کے ہم سفروں کی طرح نہ جانے کیا ہوئے۔ بے مقصدیت ترقی پسندی کا توڑ یا بدل نہیں ثابت ہوئی۔ لیکن ہم جیسے لوگوں کے لیے، جو بے مقصد زندگی جی ہی نہیں سکتے تھے، ایک گمشدگی جیسی صورت ضرور درپیش تھی۔ فیصلہ اس پر ٹھہرا کہ ہر فعل کی جوابدہی ضروری ہے، چاہے وہ شاعری ہی کیوں نہ ہو۔ شاعر کو بھی اپنے ہر فعل کے لیے جوابدہ ہونا پڑتا ہے، اپنے ضمیر کے سامنے۔ وہ ضمیر جو صدیوں کے انسانی تجربات اور مشاہدات کے خمیر سے بنا ہے، وہ ضمیر جو اختر الایمان کے ایک لڑکے کی طرح ہر موڑ پر پوچھتا ہے کہ تم کیا کر رہے اور کیوں کر رہے ہو؟ ہم نے شاعری کی اس جوابدہی کو قبول کر لیا ہے۔ ہم چاہیں بھی تو صرف اپنے لیے نہیں سوچ سکتے، کہ اردگرد والے بھی ہم جیسی زندگی ہی جی رہے ہیں اور ہمارے جیسے مسائل سے دوچار ہیں۔ زندگی کی بڑھتی ہوئی مادّیت، جنگی تجارت، تجارتی جنگ اور قدروں کی پامالی نے انہیں بھی ہماری ہی طرح عدم تحفظ کا شکار بنا رکھا ہے۔ ہماری شاعری میں گاؤں اور دیہات کئی جگہ جھانکتا نظر آئے گا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ہم ہندوستان کے سب سے بڑے شہر میں رہنے کے باجود فتح پور، دیوئی شریف، بسواں، خیرآباد، لہرپور، کرنیل گنج، ہمیر پور اور دیوریا کو اپنے اندر سے نہیں نکال پائے۔ سچ پوچھئے تو ہم آج بھی وہیں جی رہے ہیں، حالانکہ بجلی کے تاروں نے اب انکی شکلیں بھی بدل دی ہیں۔

وجہ لکھنے کی مضمون ہٰذا کی یہ ہوئی کہ برادرم الیاس شوقی، شمیم عباس اور ان کے شعری مجموعہ ''اچھی سی کوئی بات'' لے کر ہمارے گھر آئے۔ باتوں باتوں میں ہمیں انہوں نے اپنے اس فیصلے سے آگاہ کیا کہ وہ ہمارا شعری مجموعہ بھی چھاپنا چاہتے ہیں (خدا کرے انہیں اپنے اس فیصلے پر کبھی ندامت نہ ہو)۔ برادر خورد شمیم عباس نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ہم نے حساب کم و بیش کا دانی مان کر اپنا مایہ انکے سپرد کر دیا۔ اس مجموعہ کے لیے کوئی دس سال پہلے پیارے اقبال مجید بھائی نے ایک مضمون سپرد قلم کیا تھا (شاید وہ بھول بھی چکے ہوں کہ کیا لکھا تھا) ہم نے وہ بھی الیاس شوقی کو تھما دیا۔ ایک ہفتہ کے بعد وہ پھر نمودار ہوئے، فرمایا ''کم پڑ رہا ہے''۔ ہم نے کہا کہ اب اور شاعری کہاں سے لائیں، آدھی تو پہلے ہی رد کر چکے تھے۔ انہوں نے کہا ''کمال صاحب میں آپکی شاعری کا فین ہوں (قسم لے لیجیے جو ہم نے یہ جملہ اپنے طرف سے لکھا ہو) لیکن میں بھی آپ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا، آپ اپنے بارے میں خود کیوں نہیں لکھتے''۔ ہم نے عرض کی کہ اے عزیز من ہم اپنے بارے میں کیا لکھیں کہ گفتنی درج گزٹ، باقی جو ہے ناگفتنی۔ اور یوں بھی ہمیں خود نہیں معلوم کہ ہم کیا ہیں اور کیوں ہیں؟ لیکن الیاس میاں ہمارا کچھا چٹھا کھولنے کی نیت باندھ کر آئے تھے، سر ہو گئے اور ہمیں ہتھیار ڈالنے پڑے، جو عام طور ہم صرف اپنی بیوی کے آگے ڈالتے ہیں۔ چنانچہ یہ چند سطریں لکھ دی ہیں تا کہ سند رہے اور اگر ہمارے نہیں تو بوقت ضرورت آپ کے کام آئے۔

☆☆☆

فہرست

۱	ایک لفظ۔۔۔ اقبال مجید	۵
۲	من آنم کہ من دانم	۱۳
۳	دعا	۴۰
۴	پرندے لوٹ آتے ہیں	۴۲
۵	سر اٹھا کر کبھی نہ دیکھا ...	۴۷
۶	عنایت کم، محبت کم	۴۹
۷	زباں کٹ جائے گی.....	۵۱
۸	زندگی پائی ہے	۵۳
۹	کبھی اپنے لیے کبھی....	۵۵
۱۰	بساط دل کی بھلا کیا.....	۵۷
۱۱	اونچے کلس پہ دیپ.....	۵۹
۱۲	جھلسے بدن نہ سلگیں.....	۶۱
۱۳	نوح	۶۳
۱۴	کل خواب میں دیکھا...	۶۵
۱۵	جاتے جاتے وہ یہ سزا...	۶۷
۱۶	سب کی بگڑی کو بنانے نکلے	۷۰
۱۷	ایسے ظالم سے شناسائی..	۷۳
۱۸	ایک خط	۷۵
۱۹	چاند دن میں	۷۷
۲۰	مرا جسم جل رہا ہے.....	۸۰
۲۱	یقین ٹوٹ چکا ہے.....	۸۳
۲۲	در بدر کوچہ بہ کوچہ.....	۸۵
۲۳	تاریخ کا ایک صفحہ	۸۷
۲۴	بستی پہ چھایا ہے.....	۹۹
۲۵	گزر گئے ماہ و سال.....	۱۰۱
۲۶	کھڑی ہے سر پہ شبِ غم..	۱۰۳
۲۷	گلیوں کا شہزادہ	۱۰۵
۲۸	کرنوں کا جال پھینکا...	۱۰۸
۲۹	پوچھتے ہیں سب ہم سے..	۱۱۱
۳۰	ہری ہیں گودیاں.....	۱۱۳
۳۱	شاید جوز ہر شہر میں تھا.....	۱۱۵
۳۲	فراموده	۱۱۷
۳۳	غموں کو گر مرے سر.....	۱۱۹
۳۴	اپنی وجہ بربادی جانتے...	۱۲۱
۳۵	دل لٹے گا جہاں خفا.....	۱۲۳
۳۶	یہ شام الم یہ غم تمھارے...	۱۲۵
۳۷	ایک نظم	۱۲۸
۳۸	جہان آباد	۱۲۹
۳۹	ہر اک فضا سے ہر اک.....	۱۳۵
۴۰	بے وفا نامہرباں یہ سچ.....	۱۳۷
۴۱	کیسے کیسے دوستوں سے...	۱۳۹
۴۲	آخری خواہش	۱۴۱
۴۳	تو ہنس دے تو دھوپ.....	۱۴۵
۴۴	کم سے کم مل کے بچھڑنے	۱۴۷
۴۵	مری زندگی کی اداسیوں..	۱۵۰
۴۶	خوشبو لٹا گئی ہوا.....	۱۵۱
۴۷	تم ہوتے تو	۱۵۳
۴۸	دو گیت	۱۵۷

دعا

نہ تو ناز ہے نہ نیاز ہے
یہ جو دل میں سوز و گداز ہے

یہی غم تو محرمِ راز ہے
یہی غم تو اپنی نماز ہے

اسی غم کی عمر دراز ہو
یہی درد بندہ نواز ہو

نہ طلب بقائے دوام کی
نہ ہوس نمود کی نام کی

نہ کسی کرم نہ خطاب کی
نہ کسی بدل نہ جواب کی

مجھے بخشنا ہے تب بخش دے
وہ دل و نگاہ کی طاقتیں

کہ جو سوچتا ہوں بتا سکوں
کہ جو دیکھتا ہوں دِکھا سکوں

☆☆

پرندے لوٹ آتے ہیں

پرندے لوٹ آتے ہیں
گھروں سے ہجرتیں تو موسموں کی دین ہوتی ہیں
دیارِ غیر میں جب گھر کے قصے یاد آتے ہیں
پرندے لوٹ آتے ہیں
کہانی ہجرتوں کی اور پرندوں کی پرانی ہے
ہوا کہسار کو جب برف کی چادر اُڑھاتی ہے
سبک رفتار ندیاں اپنی آہستہ خرامی بھول جاتی ہیں
رُتیں جب تیز ناخن سے
ہرے پیڑوں کے تن سے پیرہن تک نوچ لیتی ہیں

ہوا دل سرد ہوتی ہے
فضا بے درد ہوتی ہے
سراسر بے رُخی کا، بے حسی کا راج ہوتا ہے
پرندے آشیانے چھوڑ جاتے ہیں
بسیروں سے وہ اپنے سارے ناتے توڑ جاتے ہیں
بس اپنے ساتھ اپنے گھر کی خوشبو
گھر کی یادیں لے کے جاتے ہیں
پرندے اجنبی دھرتی پہ آتے ہیں
اُلجھ کر زندگی میں، ہجرتوں کا غم بھلاتے ہیں

نئی دھرتی پہ اپنا گھر بناتے ہیں
نئے پنچھی نئی دھرتی پہ آنکھیں کھولتے ہیں
وہ پنچھی، جن کو پچھلے گھر کی باتیں داستاں معلوم ہوتی ہیں
مگر چھوٹے ہوئے گھر سے ہوا جب ہو کے آتی ہے
کسک پھر جاگ جاتی ہے
گھروں کی یاد آتی ہے
جو خوشبو ساتھ آئی تھی فضا میں پھیل جاتی ہے
پرندو!
آشیاں تو دل میں ہوتا ہے

لہو بن کر رگوں میں دوڑتا ہے
عادتوں میں زندہ رہتا ہے
وطن دھرتی کا اک ٹکڑا نہیں
رگ و پے میں بسی صدیوں پرانی اک روایت ہے
وطن بیتی ہوئی نسلوں کی پارینہ حکایت ہے
بدن پر رنگ بن کر
زباں بن کر دہن سے پھوٹتا ہے
وطن کب چھوٹتا ہے
نہ میں اختر شناس و پیش گو کوئی

☆☆

نہ میں رمّال و کاہن ہوں، نہ مجھ کو غیب کا کچھ علم ہے لیکن
مرے دل سے نہ جانے کیوں یہی آواز آتی ہے
کہ جب موسم بدلتے ہیں
تو اپنے آپ پھر سے
وقت کے بپھرے ہوئے تیور سنبھلتے ہیں
زمانہ خود کو دوہراتا ہے
سب دکھ بھول جاتے ہیں
دیارِ غیر میں پھر گھر کے قصے یاد آتے ہیں
پرندے لوٹ آتے ہیں

☆☆

سر اُٹھا کر نہ کبھی دیکھا کہاں بیٹھے تھے
گرتی دیوار کا سایہ تھا جہاں بیٹھے تھے

سب تھے مصروف اندھیروں کی خریداری میں
ہم سجائے ہوئے شمعوں کی دُکاں بیٹھے تھے

یہی شہرت کا سبب ہوں گے یہ معلوم نہ تھا
ہم چھپائے ہوئے زخموں کے نشاں بیٹھے تھے

لوگ تو بجھتے چراغوں کے دھوویں سے خوش تھے
ہم ہی بے کار جلائے ہوئے جاں بیٹھے تھے

میکدہ اور بھی تنہائی کا ساماں نکلا
ہم کہ تنہائی سے تنگ آ کے یہاں بیٹھے تھے

☆☆

عنایت کم، محبت کم، وفا کم
ملا سب کچھ ہمیں لیکن ملا کم

بڑی رنگین بے حد خوش نما تھی
تری دنیا میں لیکن جی لگا کم

تم اپنے غم کی تلخی بھی ملا دو
شرابِ زندگی میں ہے نشہ کم

ایک لفظ

اقبال مجید

حسن کمالؔ کی شاعری کو بیان کرنا یہاں میرا مقصد نہیں کہ یہ کام میرے مسلک سے جدا ہے۔ حسن کمال کی شخصیت کے بارے میں سوچ سوچ کر کچھ لکھنا بھی میرے لیے محال ہے کہ اس نے کبھی اپنے بارے میں سوچنے کی مہلت ہی نہیں دی۔ لکھنؤ یونیورسٹی کی یونین canteen میں پارے کی طرح تھرکتا ہوا، قہقہے لگاتا سنجیدہ ہوتا، لڑتا جھگڑتا حسن کمالؔ میری آنکھوں کے سامنے بار بار آجاتا ہے۔ کیسے کیسے لوگ تھے تب لکھنؤ میں، سرورؔ صاحب کے گھر کی محفلیں، احتشام صاحب کی محبت، کافی ہاؤس کی دوپہریں اور شامیں۔ مجازؔ صاحب بیٹھے مسکرا رہے ہیں۔ سلامؔ مچھلی شہری سگریٹ کے کش لے رہے ہیں۔ احمد جمال پاشا، سبط اختر حسن عابد، قمر رئیس، قاضی عبدالستار، آغا سہیل، حسن شہر، میم، نسیم، ڈاکٹر محمد حسن، عابد سہیل اتنے بہت سے نام اتنی بہت سی یادیں اور اس جھرمٹ میں حسن کمال!

آپ جو اس شاعر کے یہاں گھوم پھر کر گاؤں اور اس کا احساس اور اس کی تڑپ اور اس کی یادیں اور ان کی کسک دیکھیں گے تو اس کا ایک سبب ہے۔ حسن یو۔ پی

چلو یوں ہی سہی ہم بے وفا ہیں
مگر اے بے وفا تجھ سے ذرا کم

حسنؔ دنیا میں ہم نے یوں بسر کی
عداوت کم، شکایت کم، گلہ کم

☆☆

زباں کٹ جائے گی گر کچھ کہو گے
جگر پھنک جائے گا گر چپ رہو گے

ہماری داستاں گر سن بھی لو گے
زمانہ ہنستا ہے، تم بھی ہنسو گے

یہاں بنجر سروں کی کھیتیاں ہیں
یہاں تو عمر بھر بھوکے رہو گے

یہاں بس موت چن سکتے ہو اپنی
بتاؤ کب، کہاں، کیسے مروگے

جنہیں چاہو، نہ ان کے پاس پھٹکو
ہمارا تجربہ ہے رو پڑوگے

☆☆

زندگی پائی ہے اک چشمِ ستم گر کی طرح
ہم پریشاں ہیں غریبوں کے مقدر کی طرح

اپنا تن کرب و بلا بن کے جلا ہے برسوں
ہم بھی پیاسے ہیں بہت آلِ پیمبر کی طرح

اب کوئی رام نہیں غم کا دھنش جو توڑے
زندگی روتی ہے سیتا کے سوئمبر کی طرح

☆☆

ہم نے چاہا تھا کہ ہم اپنی طرح سے جی لیں
ہم پہ الزام برسنے لگے پتھر کی طرح

روز جی اُٹھتے ہیں سورج کی کرن کے ہمراہ
اور مرجاتے ہیں ہر شام سمندر کی طرح

جاتے رستوں میں کہاں اس کو گنوا آئے حسنؔ
ایک نقشہ سا نگاہوں میں جو تھا گھر کی طرح

☆☆

کبھی اپنے لیے کبھی تیرے لیے، کبھی سب کے لیے جی جلاتے رہے
ہو کسی کا بھی درد کسی کا بھی غم اسے اپنے گلے سے لگاتے رہے

نہ کسی کو کبھی ہم راز کیا، نہ کسی پہ درِ دل باز کیا
رہے دل میں اُداسی کے ڈیرے مگر ملا کوئی تو ہنستے ہنساتے رہے

کبھی پہونچے حرم میں شراب پیے، کبھی میکدے جا کے نماز پڑھی
کسی رسم جہاں کو نہ مانا کبھی، چلی جتنی بھی اپنی چلاتے رہے

☆☆

کبھی کی جو وفا تو مثال بنے، رہِ عشق میں اہلِ کمال بنے
کبھی ہم نے بھی وہ بے وفائیاں کیں، جنھیں سوچ کے برسوں لجاتے رہے

کسی شاہ و وزیر سے دل نہ ملا، کبھی جاہ و حشم کی طلب نہ ہوئی
اسی اپنی فقیری میں مست رہے، اسی شاہی میں موج اُڑاتے رہے

بڑھی حد سے اگر کبھی دل کی جلن کسی گوشۂ ویراں میں جا کے حسنؔ
کوئی شعر لکھا، کوئی بیت کہی، کبھی کہہ کے خود ہی کو سناتے رہے

☆☆

بساطِ دل کی بھلا کیا نگاہِ یار میں ہے
یہ شیشہ ٹوٹ بھی جائے تو کس شمار میں ہے

یہ جانتے ہیں کہ وہ اس طرف نہ آئے گا
عجب مزا سا مگر اس کے انتظار میں ہے

بس ایک زخم، خلش، عمر بھر کی تنہائی
وہی تو دو گے تمھارے جو اختیار میں ہے

وہ کھیل کھیلنے بیٹھے ہیں خاتمہ جس کا
تمھاری جیت میں ہے اور ہماری ہار میں ہے

☆☆

پنچھی لوٹے، ماجھی لوٹے، تو بھی لوٹ حسنؔ
دھرتی عنبر کا ہر منظر سونا کر گئی شام

اونچے کلس پہ دیپ جلا شام ہوگئی
جاگے گناہ سویا خدا شام ہوگئی

جو شخص دن کی بھیڑ میں کھویا ہوا سا تھا
کیوں اس نے کپکپا کے کہا شام ہوگئی

آؤ اب اپنے دھیان کا سورج اُگائیں ہم
ہے میکدے میں شور بپا شام ہوگئی

☆☆

کے ٹھیٹ زمیندار گھرانے کا چشم و چراغ ہے۔ تب ہی تو قصبوں کے میدانوں میں چٹکنے والی چٹک دھوپ کی مانند گرم مزاج، ابرِ باراں کے دم پر سینچی گئی فصلوں کے مانند خوددار اور پکے ہوئے آم سے لدے پیڑ کی مانند مہربان ہے۔

حسنؔ جب لکھنؤ سے سرکاری نوکری چھوڑ کر بلٹز میں بمبئی آیا تو بہت کم عمر تھا مگر ہم میں سے کسی کو تعجب نہ ہوا کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ ہم جانتے تھے کہ حسنؔ گھٹ گھٹ کر رہ رہا تھا لکھنؤ میں۔ وہاں دیکھتے ہی دیکھتے اس کے لیے سب کچھ پرانا ہو چکا تھا، بڑے سفاک دن تھے۔ بہت جلد بوڑھا کر دینے والے دن، مگر ایک ایک دن بڑا بھی تھا۔ اپنی تمام تر سفاکی کے بعد بڑا عزیز تھا۔ درد کی جس دولت کی بات حسنؔ اپنی شاعری میں بڑے پیمانے پر کرتا ہے وہ بناوٹی یا نقلی نہیں ہے۔ اس درد کو معتبر بنانے میں بہت کچھ جھیلا ہے حسنؔ نے۔

جب آپ اس کی نظم ایک خط پڑھیں گے تو آپ کو لگے گا کہ حسنؔ کی شاعری سماجی اور سیاسی اثرات کے باوجود ذاتی احساس کی شاعری ہے۔ مجھے یہ تو پتہ نہیں کہ شعر و ادب سے انسانی شعور کی توسیع و تہذیب میں مدد ملتی ہے یا نہیں، لیکن شاعری خوابوں کو سجانے میں ہماری بڑی مدد کرتی ہے، خواہ وہ نقش آب ہی کیوں نہ ہوں۔

پہلی نظر میں ہی زیرِ مطالعہ اشعار آپ کو یہ احساس دلا دیں گے کہ حسنؔ شاعری کے سُر تال پر عبور رکھتا ہے۔ صادق جذبہ و خیال سے شعر کو سجاتا ہے اور منفی قسم کی فیشن زدہ اور بے معنی جھنجھلاہٹ کے بجائے اچھی شاعری کے سبھی تلازموں کو بہ روئے کار لانے کی کوشش کرتا ہے۔ جب آپ اس کی نظم 'نوح' پڑھیں گے تو میرے اُس خیال کی تائید ہو جائے گی۔

اس مختصر سے مجموعے میں گرمیِ احساس آپ کو جگہ جگہ ملے گی اور یہ احساس

نس نس میں جیسے آگ کوئی تیرنے لگی
رگ رگ میں زہر پھیل گیا شام ہوگئی

سورج لہو لہان سمندر میں گر پڑا
دن کا غرور ٹوٹ گیا شام ہوگئی

دن بھر تو اپنے آپ سے بچتے رہے ہو تم
سنبھلو حسنؔ کمال ذرا شام ہوگئی

☆☆

جھلسے بدن نہ سلگیں آنکھیں ایسے ہیں دن رات مرے
کاش کبھی تم بھی آجاؤ بدلے ہیں حالات مرے

میں کیا جانوں کس منزل کی، کن راہوں کی کھوج میں ہوں
میرا ٹھور ٹھکانا گم ہے، کوئی نہ آئے ساتھ مرے

تم رسونتی، نرم، لجیلی، تازہ کونپل، سبز کلی
میں پت جھڑ کا مارا پیپل سوکھ چلے ہیں پات مرے

تم کیا جانو میرا جینا جیتے جی مرجانا ہے
پاپ سے دل کو لاکھ بچالوں پھنس جاتے ہیں ہاتھ مرے

☆☆

آنکھوں کو انتظار کا دے کے ہنر چلا گیا
چاہا تھا ایک شخص کو جانے کدھر چلا گیا

نوح

پھر یوں ہوا کہ زور کا طوفان آ گیا
ساری زمین ڈوب گئی صرف میں بچا
اپنے بدن کو کاٹ کے کشتی بنا تو لی
ہاتھوں کو جڑ سے توڑ کے پتوار ڈھال لی
کشتی پہ صرف اپنی ان آنکھوں کو رکھ دیا
اور پھر وہیں سے قادر مطلق کو دی صدا
"اے ربّ عالمین کوئی نامہ بر تو بھیج
منزل کہیں تو ہوگی مجھے کچھ پتہ تو دے
ساحل کوئی تو ہوگا مجھے کچھ بتا تو دے"

اور یوں ہوا کہ غیب سے آئی نہ کچھ ندا
پانی پہ گونجتی تھی فقط میری ہی صدا
پھر ناؤ میں نے گہرے سمندر میں ڈال دی
ساحل کی جستجو میں کدھر جانے چل دیا
اس کے سوائے اور تو کچھ جانتا نہیں
ساحل تو ہے ضرور اگر رہنما نہیں

☆☆

کل خواب میں دیکھا سکھی میں نے پیا کا گانو رے
کانٹا وہاں کا پھول تھا اور دھوپ جیسے چھانو رے

جو دیکھنا چاہے انھیں آ کر مجھی کو دیکھ لے
اُن کا مرا اِک روپ رے، ان کا مرا اِک نانو رے

ہے ساتھ یوں دن رات کا، کنگنا سے جیسے ہاتھ کا
دل یاد میں اُلجھا ہے یوں پایل میں جیسے پانو رے

☆☆

مہندی میں لالی جس طرح، کانوں میں بالی جس طرح
جب یوں ملے تو کیا چلے دنیا کا ہم پہ دانو رے

سب سے سَرل بھاشا وہی، سب سے مدھر بولی وہی
بولیں جو نینا بانو رے سمجھیں جو سیّاں سانو رے

ہم کب ملے، کیسے ملے، کوئی نہ جانے بھید یہ
تھوڑا بہت جانیں حسنؔ لیکن وہ ٹھہرے بانو رے

☆☆

جاتے جاتے وہ یہ سزا دے گا
مجھ کو جینے کی وہ دعا دے گا

میں کھلونا ہوں اُس کے ہاتھوں میں
جی بہل جائے گا بھلا دے گا

وقت کی مٹھیوں میں کچھ بھی نہیں
وقت دے گا تو ہم کو کیا دے گا

وہ تو آندھی کا ایک جھونکا ہے
آئے گا اور دیے بجھا دے گا

کل سنے گا جو میرا نام کہیں
پھیر کر منہ وہ مسکرا دے گا

پانیوں پر لکھی کہانی ہوں
کوئی طوفاں مجھے مٹا دے گا

خود ہی لکھے گا میرا ریت پہ نام
خود ہی قدموں سے پھر مٹا دے گا

مجھ کو انجان بن کے دیکھے گا
اور مجھے اجنبی بنا دے گا

سوکھے پتّے کی طرح تم کو حسنؔ
وقت خود شاخ سے گرا دے گا

☆☆

ایک سوچ کا حامل ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

زباں کٹ جائے گی گر کچھ کہو گے
جگر پھُنک جائے گا گر چُپ رہو گے
یہاں بس موت چُن سکتے ہو اپنی
بتاؤ کب، کہاں، کیسے مرو گے

حسنؔ روائتی بھی ہے اور جدید بھی، کہیں خوش رنگ آوازیں ہیں تو کہیں زندگی کے اُداس رنگ، لیکن اسے اپنے نظریے کی تازہ دمی اور معنویت سے بہت پیار ہے۔ 'تاریخ کا ایک صفحہ' اس کا ثبوت ہے۔

مجھے اس بات سے خوشی ہے کہ حسنؔ آج مختلف سطحوں پر کی جانے والی شاعری اس کچی شاعری کا شکار نہیں ہوا جو شاعری آج ذات کے اندھے کنویں سے آنے والی صداؤں کا Mouth Piece بن جاتی ہے اور ان صداؤں کو اس کتے کی طرح سنتی ہے جو ایک بھوپو کے سامنے بیٹھ کر اپنے مالک کی آواز سنتے ہوئے دکھایا جاتا ہے۔

مجھے اچھا یہ لگا کہ حسنؔ کے یہاں 'مانوس حقایق' اور دیکھی بھالی وارداتیں صرف اتنی ہی اہم ہیں جتنی گلاب کے لیے کھاد۔

اپنا تن کرب و بلا بن کے جلا ہے برسوں
ہم بھی پیاسے ہیں بہت آلِ پیمبر کی طرح

یہ غلط ہے کہ شاعری انجان کا انکشاف کرتی ہے۔ اس کا کام discover کرنا نہیں recreate کرنا ہے۔ وہ تو مانوس کو پردے مہیا کر کے غیر مانوس بناتی ہے اور پھر انہیں پردوں کو کچھ اس طرح ہٹاتی ہے اور ایسے زاویے دکھاتی ہے کہ اس چیز سے انسیت

سب کی بگڑی کو بنانے نکلے
یار ہم تم بھی دِوانے نکلے

دُھول ہے، ریت ہے، صحرا ہے یہاں
ہم کہاں پیاس بجھانے نکلے

ہر طرف شورِ قیامت ہے بپا
اور ہم گیت سنانے نکلے

☆☆

اب جو آئے ہو تو دو پل تو رکو
چاند پھر کب یہ نہ جانے نکلے

اتنی وحشت ہے کہ جی ڈوبتا ہے
شہر میں خاک اُڑانے نکلے

ان اندھیروں میں کرن جب ڈھونڈی
سب کے ہنسنے کے بہانے نکلے

چاند کو رات میں موت آئی تھی
لاش ہم دن کو اُٹھانے نکلے

عمر برباد یوں ہی کردی حسنؔ
خواب بھی کتنے سہانے نکلے

☆☆

ایک خط

ایسے ظالم سے شناسائی ہوئی
عمر بھر کی قید تنہائی ہوئی

سِل گئے لب اور زباں جب کٹ گئی
تب تری محفل میں شنوائی ہوئی

خواب، حسرت، روشنی، خوشبو، نشہ
سب تری شکلیں ہیں من بھائی ہوئی

دیکھ کر تجھ کو شرابی ہوگیا
توڑدی میں نے قسم کھائی ہوئی

ہم تری محفل سے پیاسے اُٹھ گئے
اِس میں تیری بھی تو رسوائی ہوئی

☆☆

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

ایک خط

باتیں، لڑائی جھگڑے، شرابیں، مباحثے
ایک دوسرے کی کاٹ،
بھلا اپنا، جوڑ توڑ،
ہر چیز چھین لینے، جھپٹ لینے کی ہوس
اب اور اپنا حال لکھوں کیا، سمجھ لو بس
اللہ کا لاکھ شکر ہے میں خیریت سے ہوں
اس شہر نے غرض مجھے جینا سکھا دیا
تم اپنی خیریت سے کبھی مطلع کرو

کچھ اپنا حال، گاؤں کا کچھ ماجرا لکھو
ساون میں اب بھی کھیت نہاتے ہیں یا نہیں
فصلیں کٹیں تو شور مچاتے ہیں یا نہیں
راتیں تھپک تھپک کے سلاتی ہیں یا نہیں
پنگھٹ پہ آ کے مجسمیں نہاتی ہیں یا نہیں
گر ہو سکے تو پیار کے دو بول بھیج دو
ممکن اگر ہو گاؤں کا ماحول بھیج دو

☆☆

چاند دن میں

شب کو وہ کیسا چمکتا
مسکراتا
جگمگاتا
بادلوں کو اُنگلیوں سے گدگداتا
آسماں کے صحن میں
دھرتی کے آنگن میں

پہاڑوں کے ورانڈے میں
مچلتا دوڑتا تھا
اور دن کو بھی وہ کتنی شان سے
کیسی بے خوفی سے
کتنی آن سے
سادے کاغذ کی طرح بے رنگ و روغن
لکڑی کے بے جان ٹکڑوں کی طرح بن روپ رنگت
سامنے آ کر کھڑا ہے
چاند بھی کتنا بڑا ہے
آؤ ہم بھی چاند سے

بڑھنے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ ہم اس سے مانوس ہو جاتے ہیں۔ جیسے آخری خواہش۔

میں یہ بھی نہیں مانتا کہ آرٹ تعصّبات اور تحفظات کے حصاروں پر حملہ کا نام ہے۔ بات ذرا ترچھی ہے۔ مگر مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ آرٹ نئے تعصّبات اور نئے تحفظات کی تجدید کا نام ہے۔ ایسا کرنے کے بعد آرٹ تھوڑی دیر ستاتا ہے اور آرام کرتا ہے۔ اور اس عرصۂ آرام میں وقت گذاری کے لیے پوسٹر لکھواتا رہتا ہے۔ اس پوسٹر بازی سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ آخر آرٹ میں بھی جان ہوتی ہے۔ اسے بھی آرام کی ضرورت ہے۔ یہاں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ جو لوگ 'انکشاف' کے لیے تخلیقی ذہن کو غیر مشروط رکھنا چاہتے ہیں، ان کے لیے انکشاف بس ایک اندھے کے ہاتھ کی بٹیر ہے۔ ہر تخلیق مشروط ہوتی ہے۔ اور شرطوں کے پائدانوں سے ہی بلندیوں تک جاتی ہے۔ یا پستیوں تک واپس آتی ہے۔ جو لوگ اپنی شاعرانہ شخصیت کو ہر نوع کے رویہ سازی کی ترغیبات سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں وہ دراصل بڑے سیدھے سادے ہوتے ہیں، اور نہیں جانتے کہ دراصل یہ بھی ایک رویّہ ہے مگر افسوس کہ محض رویوں سے شاعری پیدا نہیں ہوتی۔

لوگ poetic precesion کا ترجمہ شعری چوکسائی تو کر لیتے ہیں لیکن اسے جدید آرٹ کی امتیازی صفت بھی بتاتے ہیں۔ گویا شعری چوکسائی صرف جدید شاعری کا ہی امتیاز ہے۔ پتہ نہیں وہ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ میر اور غالب کی دکان بھی اسی چوکسائی (precesion) پر قائم ہے۔

ہے کہاں تمنّا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

تو حسن بھی پچھلے ۳۵ سال سے شاعری کر رہا ہے وہ جانتا ہے کہ نہ تو خطر پسندی ہی تنہا

جینے کا یہ انداز سیکھیں
ساری دنیا کو بتا دیں
کاروباری مسکراہٹ کی تہوں میں کیا چھپا ہے
باتوں کے رنگین غباروں کے اندر کیا بھرا ہے
اور تب دنیا سے پوچھیں
اب بتاؤ کون ہم کو چاہتا ہے!

☆☆

مرا جسم جل رہا ہے یہ کس آگ میں نہ جانے
یونہی چھو لیے تھے میں نے ترے لب کسی بہانے

تو جہاں بھی ہو، رہیں گے مرے ساتھ ساتھ ہر دم
تری گفتگو کے موسم، ترے ذکر کے زمانے

مرا شعر کیا، غزل کیا، ترا نور تیری خوشبو
ترے ہونٹ، تیری آنکھیں، مری پیاس کے فسانے

تری چشم، تیرے ابرو، ترا جسم، تیرے گیسو
میں جدھر جدھر سے گزروں ہیں اُدھر شراب خانے

تری آہٹوں سے روشن مری خلوتوں کی محفل
مری محفلوں کی رونق تری یاد ہر بہانے

جو نگاہ کہہ چکی ہے جو زباں نہ کہہ سکے گی
تری آرزو وہ کہہ دوں، تو اگر بُرا نہ مانے

میں سنا رہا تھا سب کو یہ غزل حسنؔ تو اس نے
کہا شعر ہیں یہ ہم پر، یہ ہمیں کو تھے سنانے

☆☆

راتوں کے رتجگے گئے دن کی وہ محفلیں گئیں
کوئی سمیٹ کر مرے شام و سحر چلا گیا

یقین ٹوٹ چکا ہے گمان باقی ہے
ہمارے سر پہ ابھی آسمان باقی ہے

چلے تو آئے ہیں ہم خواب سے حقیقت تک
سفر طویل تھا اب تک تکان باقی ہے

انھیں یہ زعم کہ فریاد کا چلن نہ رہا
ہمیں یقین کہ منہ میں زبان باقی ہے

ہر ایک سمت سے پتھراؤ ہے مگر اب تک
لہولہان پرندے میں جان باقی ہے

فسانہ شہر کی تعمیر کا سنانے کو
گلی کے موڑ پہ ٹوٹا مکان باقی ہے

ملا نہ جو ہمیں قاتل کی آستیں پہ حسنؔ
اسی لہو کا زمیں پہ نشان باقی ہے

☆☆

در بدر کوچہ بہ کوچہ دیر تک بھٹکے گی رات
پھر تھکن سے چور ہو کر میرے گھر ٹھہرے گی رات

پہلے پی کر خوب ہنگامے کرے گی بزم میں
دل کی تنہائی سے آخر دوستی کر لے گی رات

اُجڑی آنکھوں میں بسا کر جھوٹے خوابوں کی خلش
جھکتی پلکوں کو مری پھر پیار سے چومے گی رات

بے وفا محبوب کی مانند رخصت دن ہوا
ایک اک پل کا حساب اب دیکھنا مانگے گی رات

کیسے طے ہوں گے بھلا یہ روز و شب کے فاصلے
ہم تو سو جائیں گے تھک کر جاگ کر سوچے گی رات

آیئے اب لوٹ چلیے گھر کی جانب اے حسنؔ
آپ کو گھر میں نہ پا کر رات بھر جاگے گی رات

☆☆

تاریخ کا ایک صفحہ

کوئی مورّخِ فردا کبھی جو لکھے گا
کہ میرے دور میں کیا کاروبار ہوتا تھا
کسے نصیب تھی تکریم و جاہ کی دولت
ستم رسیدوں میں کس کا شمار ہوتا تھا

میں سوچتا ہوں کہ وہ کیا لکھے گا آج کا حال
کوئی تو بات نہیں آج قابلِ تحریر
یہی لکھے گا کہ جینے کو لوگ جیتے تھے
حیات ان کی مگر آرزو کی تھی تعزیر

یہی لکھے گا کہ کچھ سکّے کاغذی ٹکڑے
تمام دین و مذاہب خرید سکتے تھے
دماغ و ذہن یہاں رہن رکھے جاتے تھے
دِل و ضمیر تو مٹّی کے بھاؤ بکتے تھے

معاشرت ہو سیاست ہو یا ہو علم و ادب
ہر ایک شے پہ رہیں ثبت نقرئی مہریں
وہی تھے اہلِ قلم جو بہ فیضِ زورِ قلم
حقیقتوں کو فسانہ بنا کے پیش کریں

آرٹ کے لیے موزوں ہے اور نہ عافیت کوشی ۔ کیوں کہ اس کی آنکھوں کے سامنے بڑے بڑے خطر پسند مرغ کی چونچ میں سورج اگا کر بھسم ہو گئے ۔ رہ گئی عافیت کوشی تو وہ حسنؔ کے مزاج کا غالب عنصر کبھی نہیں رہا۔ وہ تو ان دونوں کے امتزاج سے ہی شعر کے کاروبار کو چلا رہا ہے۔

یقیں ٹوٹ چکا ہے گماں باقی ہے
ہمارے سر پہ ابھی آسماں باقی ہے
انھیں یہ زعم کہ فریاد کا چلن نہ رہا
ہمیں یقین کہ منہ میں زبان باقی ہے

جس طرح آرٹ میں مجہول عافیت کوشی معتبر نہیں اسی طرح لایعنی خطر پسندی بھی محض بکواس ہے، شاعری کے لیے مشکل یہ ہے کہ کرتب بازی سے الگ چیز ہے، ورنہ پانچ سو فٹ اونچی سیڑھی سے بدن میں آگ لگا کر پانی میں کودنے والا خطر پسند فیضؔ کے درجے کا شاعر تو ضرور ہوتا۔ اس لیے شاعری میں خطر پسندی اور عافیت کوشی ذاتی رویوں کے طور پر نہیں بلکہ فنکارانہ مہارت کے ساتھ موقع اور محل پر tool کے طور پر استعمال ہونا ضروری ہیں یہ موقع اور محل کی شناخت اور ان اوزاروں کے استعمال کا سلیقہ بازار میں نہیں بکتا۔ اسی کے لیے تو شاعر دعا کرتا ہے۔ حسنؔ نے بھی اسی دعا سے اپنے کلام کی ابتدا کی ہے۔

مجھے بخشا ہے تو بخش دے وہ دِل و نگاہ کی طاقتیں
کہ جو سوچتا ہوں بتا سکوں کہ جو دیکھتا ہوں دکھا سکوں

یہ بالکل درست ہے کہ ہر ایماندار شاعر مشاہدے کو عرفان میں بدلنے کی دعا مانگتا ہے۔

عجیب بات تھی جو رہزنی میں کامل ہو
وہ اس زمانے میں رہبر بنایا جاتا تھا
جو کارواں کا بہی خواہ کوئی ہوجاتا
وہ آگہی کا صلہ قید ہوکے پاتا تھا

جو اپنا پیار چھپاتا جرم کی صورت
زمانہ اس کو بڑا نیک خو سمجھتا تھا
ضمیر بیچ کے پاتا تھا گر کوئی دولت
اسے ہر ایک بہت سرخ رو سمجھتا تھا

خدا کا نام جو لیتا گناہ سے پہلے
تو اس کا خوب یہاں احترام ہوتا تھا
عبادتوں کو تجارت کی صف میں جولاتا
تو اُس کا ایک زمانے میں نام ہوتا تھا

جو پیار کو نہیں گردانتا تھا جرم کوئی
تو اس زمانے میں بے حد گناہ گار تھا وہ
جو تیغِ ظلم سہے بدنصیب کہلاتا
جو تیغِ ظلم چلائے تو ہوشیار تھا وہ

غریبوں، فاقہ کشوں کو دبا کے جو رکھ دے
تمام نظمِ حکومت پہ اختیار اس کا
جنونِ قومیت و نسل و مذہب و ملّت
سیاستوں میں جو ڈھالے تو اقتدار اس کا

سیاہ رات کو گر رات کوئی کہہ دیتا
تو اس کو تنگ نظر کا خطاب ملتا تھا
بلند فکر تھی جن کی تھا جن کا ذہن وسیع
انھیں مریض سا دورِ شباب ملتا تھا

جو کوئی آرزو کرتا تھا سربلندی کی
فرازِ دار پہ وہ سر اُٹھانے پاتا تھا
شکست ہوتے تھے اخلاق کے جب آئینے
تب اس کے بعد کوئی سر اُٹھانے پاتا تھا

کتابوں میں تو یہ لکھا ہے، تھا وہ دورِ عوام
نظامِ ملک کا جمہوریت ہی نام بھی تھا
مگر امیر چلاتے تھے توسنِ جمہور
کہ سرکشوں کو چلانا اُنھیں کا کام بھی تھا

غریب جسم کے خوں کو شراب کی مانند
جو رات دن کوئی پیتا تو مالدار تھا وہ
کوئی غموں کو بُھلانے کے واسطے مے کی
جو ایک بوند بھی پیتا حرام کار تھا وہ

عجیب بات تھی جو سو چراغ گُل کرتا
اُسی کے گھر میں چراغاں منایا جاتا تھا
جو سب کے گھر میں اُجالوں کی بات کرتا تھا
اُسے اندھیرے نگر میں بسایا جاتا تھا

جو لوگ جینے کے خواہاں تھے اُن کی تھی یہ سزا
کہ ایک زیست ملے موت سے زیادہ خراب
جو اپنی فکر سے لیتے تھے کہکشاں سے خراج
اُنھیں کو حکم تھا، دیں اپنے خونِ دل کا حساب

بزرگ مرتے تھے اور سر اُٹھاتی نسلوں سے
زمانہ لیتا تھا اُن کے کیے گُنہ کا قصاص
کہ ان کو اپنے بزرگوں سے صرف ملتی تھی
غرور، ناز، نمائش، روایتوں کی اثاث

ہر اِک ابوجہل و لودن و غبی و لئیم
نوازا جاتا تھا القاب سے خطابوں سے
روایتوں کی لکیروں کو پیٹنے والا
سراہا جاتا تھا اخباروں سے کتابوں سے

جو جوڑ توڑ کا ماہر، وہ حاکمِ اعلیٰ
شریف نفس تھا جس کا وہ ننگ و خوار رہا
جو مصلحت کے بتوں پر جھکا دے اپنی جبیں
وہ مومنین کی صف کا اُمیدوار رہا

حقوقِ غیر غصب کر کے جو بڑھے آگے
تو صرف اس کو ہی مردم شناس کہتے تھے
جو دوسروں کی فضیلت کا احترام کرے
تو اس کو پست دل و ناسپاس کہتے تھے

گھروں کو پھر سے بسانے کی بحث کم تھی مگر
یہ مسئلہ تھا کہ بم جوہری بنے نہ بنے
یہ فکر کم تھی کہ بھوکوں کو مل سکے روٹی
سوال یہ تھا کہ لشکر جری بنے نہ بنے

مگر نہ جانے اُسے اس کا علم بھی ہوگا
کہ اس اندھیرے میں بھی کچھ چراغ جلتے تھے
نظر میں جن کی منور تھی اک نئی دنیا
جو اپنے خون سے کل کی کتاب لکھتے تھے

مرے مؤرّخِ فردا تجھے مبارک ہو
کہ تو ہے پاک ان امراض سے جو ہم کو ملے
مگر یہ یاد رہے تیرے چاکِ دامن بھی
انھیں کی سوزنِ فکر و دل و نظر سے سلے

جو اس اندھیرے زمانے یوں چمکتے تھے
کہ جیسے جلتے ہوں ویران وادیوں میں دِیے
وہ جن کے ذہن پہ پہرے بٹھائے جاتے تھے
وہ جن کے ہونٹ زمانے نے ہر قدم پہ سلے

☆☆